
معیاری ادب نمبر ۳۰

انتخاب مضامینِ سرسید

تصحیح و ترتیب

انور صدیقی

سرسید ایسے جامع کمالات بزرگوں میں سے تھے جو بیک وقت تہذیب، مذہب، طب، فقہ، سیرت، علم الکلام اور تفسیر کے تمام تر موضوعات پر اسی اعتماد کے ساتھ قلم اٹھاتے تھے جس اعتماد کے ساتھ وہ سیاست، تعلیم اور ادب کے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ اس انتخاب میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ ان کے تمام نثری وسائل کے اظہار کی نمایندگی ہو جائے۔

قیمت:- طلبہ اڈیشن ۲/۸۰
لائبریری اڈیشن ۳/۴۰

معیاری ادب نمبر ۲۹

انتخابِ ذوق

تصحیح و ترتیب

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

ذوق کی شاعری، ہماری کلاسیکل شاعری کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ خاص طور پر اُن کے قصائد، جو اُن کے کمالِ فن کا بہترین ثبوت ہیں۔ اُن کی علمی فضا، اُن کا فکری ماحول، بے رخنہ بندشِ الفاظ اور استادانہ اسلوب اور اُن کے اُردو قصائد کو اُردو کی مدحیاتی ادب میں ایک خاص اور بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں......

اس انتخاب میں ذوق کے قصیدے ہیں اور غزلیں بھی، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی گئی ہے۔

قیمت:- طلبہ اڈیشن ۳/۵۰
لائبریری اڈیشن ۴/۲۵

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی تازہ ترین کتابیں

بنگرواڑی مصنف: وینکٹیش ماڈگولکر مترجم: عرش ملسیانی

"بنگرواڑی" ماڈگولکر کا سب سے پہلا ناول ہے جس نے انھیں سب سے زیادہ شہرت عطا کی۔ دیہاتی زندگی کی تصویرکشی کرنے والے ناول کی حیثیت سے "بنگرواڑی" بے شک و شبہ ایک قابلِ فخر تخلیق ہے۔

قیمت ۵/۲۵

آبِ حیات مصنف: محمد حسین آزاد تلخیص و مقدمہ: سید احتشام حسین

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی قدر و قیمت کے متعلق ادب کے مورخ اور نقاد آپس ہی میں الجھتے اور بحث کرتے ہیں۔ مگر اس کی زندگی بڑھتی رہتی ہے اور یہی اس کی ادبیت کا کمال ہے، یہی اس کے اسلوب و بیان کا معجزہ۔ ایک تاریخی دستاویز۔

قیمت ۶/۷۵

شاعر مصنف: تاراشنکر بندوپادھیائے ترجمہ: پریش کمار ڈے

یہ ناول پہلی بار بنگلہ زبان میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور اپنے وقت کا عظیم ناول قرار دیا گیا تھا۔

تاراشنکر بندوپادھیائے میں عظیم تخلیقی قوت اور کردار نگاری کی باریک بیں صلاحیت تھی۔ جس نے اس ناول کو عوام میں بے حد مقبول [illegible]

قیمت ۸/۷۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلی ۲۵، دلی ۶، بمبئی ۳ اور علی گڑھ ۲

"ناولستان" کی تازہ پیشکش

اللہ میگھ دے

(ناول)

رضیہ سجاد ظہیر

"عورت جب بھی ماں ہوتی ہے تو وہ اصلی ماں ہوتی ہے — انھوں نے مجھے جنم نہیں دیا مگر صرف وہی ماں نہیں ہوتی جو جنم دے" یہ ایک ایسی ماں اور بیٹی کی کہانی ہے جن کی قربانیاں شامل ہیں۔ اس ناول کا آخری باب — (برسوں بعد — جب یہ کسی ناول کا پہلا باب ہوگا) آپ کے ذہن میں برسوں محفوظ رہے گا۔

قیمت : ۶/۵۰

اُلجھی ڈور

(ناول)

صالحہ عابد حسین

آج کی نوجوان لڑکیاں کن کن اُلجھنوں کا شکار ہیں، ان کے ذہنوں میں کس قسم کے خیالات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ مستقبل کو کس زاویے سے دیکھتی ہیں؟ یہ ناول اسی کشمکش کو پیش کرتا ہے

قیمت ۴/۵۰

معیاری ادب نمبر ۲۸

انتخاب محمد قلی قطب شاہ

تصحیح و ترتیب

محمد اکبر الدین صدیقی

قلی قطب شاہ کے کلام میں جدتِ خیال بھی ہے، معنی آفرینی بھی۔ [illegible]
بھی ہے اور تیکھا پن بھی۔ سطوتِ شاعرانہ بھی ہے اور جمالیاتی [illegible]
کا کمال بھی۔ مقامی رنگ بھی ہے اور مئے گل رنگ بھی۔ اس کا کلام چا[illegible]
پہلے کی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع اور معاشرے کی زندہ تاریخ ہے۔

قیمت:- طلبہ ایڈیشن ۴/۵۰
لائبریری ایڈیشن ۵/۵۰

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی

بچوں کے لیے انتہائی خوبصورت کتابیں

(حصہ اول)	مصنف: ایف، سی، نریٹیاس	مترجم: صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
(" دوم)	" " "	" " "	۱/۵۰
ہر	" مالا سنگھ. تصاویر: پریانند	" خدیجہ عظیم	۱/۵۰
دس کی دنیا	" جمال آرا	" محمد شفیع الدین نیر	۱/۵۰
ہ کی چوٹیوں پر	" برگیڈیر گیان سنگھ	" محمد ذاکر	۱/۵۰
ی ندیوں کی کہانی (حصہ اول)	" لیلا مجمدار	" رضیہ سجاد ظہیر	۱/۵۰
۔ کی سیر اور دوسری کہانیاں	" لیلاوتی بھاگوت	" " "	۱/۵۰
بلی کہانیاں	" منوج داس	" صغرا مہدی	۱/۵۰
دی کی کہانی (حصہ اول)	" وشنو پربھاکر	" انور کمال حسینی	۱/۵۰
ی ریلیں	" جگجیت سنگھ	" عرش ملسیانی	۱/۵۰
دستان میں غیر ملکی سیاح	" کے، سی، کھنہ	تصاویر: کرشن کھنہ	۱/۵۰
انک کھیلیں	" ادمانند	مترجم: رفیعہ منظور الامین	۱/۵۰
۔ بلی کا خاندان	" منوہر داس چترویدی	" محمد شفیع الدین نیر	۱/۵۰
۔ دن ہوئے (حصہ اول)	" ایم، چوکسی و پی، ایم، جوشی	" رضیہ سجاد ظہیر	۱/۵۰
درون کی کہانیاں	" راجندر اوستھی	" انور کمال حسینی	۱/۵۰
ہنت ونندیہ	" کرشن چیتنیہ	" " "	۱/۵۰
ا بہار کہانیاں	" شانتا رنگاچاری	" " "	۱/۵۰
خاں کی بکری	" ڈاکٹر ذاکر حسین		۳/
ھی دکان	" قدسیہ زیدی		۲/۵۰
بوچھیا اور پریزاد	" " "		۲/
اسکے جانور	" " "		۲/۵۰

نیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی ۲۵ دلی ۶ بمبئی ۳ اور علی گڑھ ۲

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دلّی ۲۵

کا خصوصی نمبر

نئی نظم کا سفر

نیجنگ اڈیٹر۔ شاہد علی خاں

ڈیٹر۔ ولی شاہجہاں پوری

ہمان اڈیٹر۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

تابت ۔ ایس، ایم، مظہر

سمبر ۱۹۷۳ء

سالانہ قیمت ۔ تین روپے ۔ فی شمارہ ۳۰ پیسے

ئبریری کے لیے ۔ سالانہ ایک روپیہ

ں خصوصی شمارے کی قیمت ۶/۵۰ (علاوہ محصول ڈاک)

ریداران کتاب نما کے لیے ۴/۵۰ (علاوہ محصول ڈاک)

طبع ۔ جمال پرنٹنگ پریس دلی ۶

اداریہ

شاہی جلوس بڑے طمطراق سے گزر رہا تھا۔ رنگا رنگ اور بھڑکیلے لباس میں ایک انبوہ تھا جو شاہی نینس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ کسی کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سب اپنے اصلی چہروں پر مسرت کا ایک مصنوعی نقاب ڈالے ہوئے جلوس میں شامل تھے۔ احتیاطاً دلوں کی دھڑکن کو بھی بلند نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر اچانک طوفانی ہوا چلی اور جلوس منتشر ہوگیا۔ تصنع کے نقاب اڑ گئے اور دلوں میں بیٹھا ہوا غبار اڑ کر چہروں پر آ گیا۔ لق و دق میدان میں شاہی نینس اٹھا کر چلنے والا کہار اپنے بوسیدہ پیکر میں اپنی روح کو سمیٹے ہوئے تھا۔ کرب اذیت نے اسے بے جان کر دیا تھا۔ قریب سے جب اس کے مردے کو دیکھا گیا تو اس کی آنکھوں میں ویران تنہائیوں کا ایک ہجوم تھا۔

جب شاہی جلوس مرتب تھا تو نظر شاہ پر تھی۔ جب منتشر ہوا اور شاہی نینس اپنے دبیز پردوں کے ساتھ ہوا ہوگیا تو جلوس کے شرکا نگاہوں میں آنے لگے اور کہار مرکز توجہ ہوا۔ جب کہار کے مردہ جسم کی بے نور آنکھوں کو دیکھا گیا تو تنہائیاں سامنے آئیں۔ اور اب صرف تنہائیاں ہیں۔ تنہائیوں کا ہجوم فرد کی ذات کے ٹکڑے ٹکڑے میں اپنے کو لپیٹ رہا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ فرد کی ذات کے ٹکڑے اہم ہیں یا تنہائیوں کی ویران کثرت۔

اگر شاہ نہ ہوتا تو جلوس نہ ہوتا۔ اگر جلوس نہ ہوتا تو کہار نہ ہوتا اگر کہار نہ ہوتا تو تنہائی کی ویرانی نہ ہوتی۔ مگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ نہ بھی ہوتا تو جلوس ہوتا جلوس نہ بھی ہوتا تو کہار ہوتا۔ کہار نہ بھی ہوتا تو تنہائی ہوتی۔ ہر ایک کا وجود اپنی جگہ اہم بھی ہے اور غیر اہم بھی۔ ہر ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتا ہے تنقیص بھی۔

روح شاعری جو ایک کے بعد دوسرے کا مشاہدہ کرتی چلی آئی ہے، ہر منظر کو لازم بھی بنائے ہوئے ہے ملزوم بھی۔ دربار سے عوام تک، عوام سے فرد تک

اور فرد سے فرد کی محروم روح تک اردو نظم نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ یہ مجموعہ اس سفر کی صرف آخری دو منزلوں کی روداد پر مشتمل ہے۔

کتاب نما کتابوں کی دنیا کا قطب نما بن کر سامنے آیا تھا۔ اس نے اپنے فریضے میں صرف نئی تخلیقات سے روشناس کو اہمیت دی تھی مگر کبھی کبھی اس نے اصناف ادب کے تجزیے بھی پیش کیے۔ غزل پر ہمارا ایک نمبر قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا مگر اب کی مرتبہ ہم نے اپنی تمام سابقہ روایات سے ہٹ کر ایک مخصوص صنف کے انتخاب پر ایک پورا اور نہایت ضخیم نمبر نکالنے کا تہیہ کیا۔ خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی کی برسوں کی کاوشں کو ایک نمبر کی صورت میں پیش کرنا اگرچہ ہمارے محدود وسائل کی بنا پر آسان نہ تھا مگر ہم اپنی سی کر گزرے اب دیکھیں لوگ اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں یا روایتی مغائرت کی نذر کر دیتے ہیں۔ قدر حوصلہ افزائی تو کر سکتی ہے لیکن کہلاتے ہیں کہ مغائرت ہمارے حوصلے پست نہیں کر سکتی۔ مکتبہ جس جرأت رندانہ سے آج کام لے رہا ہے یہ اس کے وجود کے لیے سنبھلنے کا سبب بھی ہو سکتا ہے اور سنبھالے کی علامت بھی۔ ہم نے یوسف کو مصر کے بازار میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اب دیکھیں اس جنس گراں کا کوئی خریدار بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

اڈیٹر

نئی نظم کا سفر

(۱۹۳۶ء کے بعد)

مرتبہ

خلیل الرحمٰن اعظمی

صلاح کار

ڈاکٹر منیب الرحمٰن ڈاکٹر وحید اختر

۹۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار۔ دلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

نومبر ۱۹۷۲ء

قیمت ۶/۵۰

(جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی)

ترتیب

ابتدائیہ

شعری انتخابات مرتب کرنے کی روایت ہمارے یہاں نئی نہیں ہے مگر ان انتخابات کی نوعیت عام طور پر بیاض یا گلدستوں کی سی ہوتی ہے۔ مرتبین کا مقصد یا تو اپنی پسندیدہ شعری تخلیقات کو یکجا کر دینا ہوتا ہے یا تذکرہ نگاری کے اصول پر کسی عہد کے معروف اور نمایندہ شعرا کی ایک فہرست سامنے رکھ کر اُن شعرا کے کلام سے کچھ ایسے نمونے فراہم کر دینا جو اُن کے مخصوص رنگ کی نمایندگی کرتے ہوں۔ بعض اوقات کسی ایک موضوع مثلاً مناظرِ فطرت یا آزادیٔ ہند وغیرہ کے پیشِ نظر مختلف شعرا کی منظومات کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ اِن شعری انتخابات کی بھی اپنی افادیت ہے مگر ان کے پیچھے کوئی ایسا تنقیدی شعور نہیں ہوتا جو فنی اور تخلیقی عمل سے متعلق نتیجہ خیز حقائق تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

حالی سے لے کر اب تک ہمارے یہاں جو تنقیدی مکتبِ فکر بہت زیادہ مقبول ہو رہا ہے، اس نے ہمیں بعض دائروں میں محصور کر دیا ہے۔ مثلاً ہم شاعری یا شاعر کا مطالعہ موضوع یا مواد کی افادیت کے پیشِ نظر کرتے ہیں اور اس افادیت کو بھی سیاسی یا قومی مسائل تک محدود رکھتے ہیں۔ شعری تخلیقات کے مطالعے میں فنی، تخلیقی اور جمالیاتی شرائط یا معیار کو نظر انداز کرنے سے بعض اوقات ہم اپنے اچھے اور قابلِ قدر شعرا کے بھی [illegible] کلام پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں جس کی ہنگامی یا دستاویزی اہمیت زیادہ

ہے مگر فنی یا تخلیقی اعتبار سے اس میں پائداری اور گہرائی نہیں۔ خود اسی شاعر کے ذخیرۂ کلام سے بعض ایسی تخلیقات ہم سے خراجِ تحسین نہیں حاصل کر پاتیں جو بظاہر کسی غیر اہم، نجی یا نامعلوم اور بے نام تجربے کے بطن سے برآمد ہوئی ہوں لیکن ان میں شاعر کی تخلیقی توانائی کا زیادہ بھرپور اور موثر اظہار ہوا ہو۔ اس تنقیدی مزاج نے ہماری تنقید کے بہت بڑے ذخیرے کو سیاسی و سماجی تشریح بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان تنقیدوں کی مکتبی، صحافتی یا اشتہاری اہمیت و افادیت جو بھی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم ان کی مدد سے نہ شعر کے تخلیقی عمل کو سمجھ سکتے ہیں نہ حقیقی شاعری اور غیر حقیقی شاعری میں کوئی امتیاز قایم کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس تنقیدی مزاج نے غیر حقیقی شاعری کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین ہموار کی ہے۔ وہ اس طور پر کہ بعض موضوعات اور مسائل کی اہمیت اور افادیت کا چرچا سن کر میکانکی طور پر شعر کہنے یا نظم بنانے والے حضرات بڑی آسانی سے ان موضوعات پر کچھ خیالات کو منظوم کر دیتے ہیں اور ان حقیقی شعرا کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت اور سرخروئی حاصل کر لیتے ہیں جو اُس وقت تک کسی موضوع پر شعر نہیں کہہ سکتے جب تک وہ ان کی داخلی شخصیت اور ان کے نجی تجربے سے ہم آہنگ نہ ہو جائے اور تخلیقی مراحل سے گزر کر فن پارے کی صورت اختیار نہ کر لے۔

زیرِ نظر انتخاب کا مقصد ۱۹۳۶ء کے بعد کی اُردو نظم کا مطالعہ و مشاہدہ ہے۔ ہم نے دانستہ طور پر افادی اور دستاویزی طریقۂ کار سے انحراف کر کے ایسے اصول کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس کی رو سے ہم ان تخلیقات کو ترجیح دیں جن سے اُردو نظم کے فنی اور جمالیاتی ارتقا [illegible] نوع کی مدد ملی ہے۔ اقبال اور جوش کے عہد کے بعد اُردو نظم کی ہیئت، اسلوب، طریقِ کار، رویّے، مزاج، لب و لہجہ، آہنگ

اور صناعی اعتبار سے جہاں جہاں ہمیں تازگی کا احساس ہوا ہے وہاں وہاں ہماری نظر رکی ہے اور ہم نے ان منظومات کو بار بار پڑھنے اور اُن کے معنی کے پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تخلیقات کے مطالعے کے دوران نہ تو ان نظموں کے بارے میں سکّہ بند اور مقبولِ عام رایوں پر بھروسہ کیا گیا ہے اور نہ شاعروں میں سے کسی کو بڑا یا چھوٹا، یا اہم اور غیر اہم سمجھا گیا ہے، نہ ہمارے پیشِ نظر اس قسم کا اصول کارفرما رہا ہے کہ فلاں شاعر کی کم از کم کتنی نظمیں شامل کی جائیں، نہ ہم نے سیاسی یا سماجی موضوعات کو شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اس طرح کی نظموں کو انتخاب سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، نہ ہم نے اس بات کی کوئی پروا کی ہے کہ اس دور کا کوئی معروف و مقبول شاعر یا کسی شاعر کی بہت مشہور نظم اس انتخاب میں جگہ نہ پا سکی تو انتخاب ناقص اور نامکمل رہے گا۔

ہمارے پیشِ نظر صرف یہ بات رہی ہے کہ ہم ۱۹۳۶ء کے بعد کے شعرا کا مطالعہ اس زاویے سے کریں کہ اقبال اور جوش کے عہد تک کی نظم جس منزل پر پہنچ گئی تھی اس کے بعد انحراف و انقطاع کی جو صورتیں کسی نہ کسی طرح سے اُبھری ہیں ہماری گرفت میں آ سکیں۔ یعنی اگر ایک شاعر نے اس دور میں بھی کچھ ایسی نظمیں لکھی ہیں جو مسائل اور موضوعات کے اعتبار سے نئی اور مختلف ہیں لیکن اسلوب، رویے، مزاج، لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے گزشتہ دور کے شعرا کی یاد دلاتی ہیں تو ہم نے ایسی نظموں سے قطعِ نظر کیا ہے، اگر اس شاعر نے ایک یا ایک سے زیادہ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں گزشتہ شعرا سے الگ ایک آواز سنائی دیتی ہے اور اس کی یہ نظم کسی نہ کسی اعتبار سے نظم نگاری کی روایت میں تنوع یا اضافے کا سبب بنتی ہے تو وہ ہمارے لیے قابلِ ترجیح ہے۔ جن شعرا کے یہاں سو فی صدی گزشتہ شعرا کے اسالیب یا طریقِ کار کا اعادہ ہے انھیں ہم نے اس انتخاب میں

شامل نہیں کیا ہے۔ یعنی اس دور کے جو شعرا عصری موضوعات پر لکھنے کے باوجود
حالی، چکبست، ظفر علی خاں، اقبال، جوش، اختر شیرانی وغیرہ کے طرز میں ہی لکھے
رہے وہ ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔

اردو نظم کے فنی ارتقا کا اگر دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہم اس
نتیجے پر پہنچیں گے کہ نظم نگاری کی روایت اگرچہ ہمارے یہاں بہت پرانی ہے لیکن فنی
اعتبار سے ۱۹۳۶ء کے بعد کا دور ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی مغرب کے اثر سے نظم کے سانچوں اور اس کے
اسالیب میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو گیا تھا لیکن ان کو تخلیقی توانائی ۱۹۳۶ء
کے بعد والے دور میں ہی نصیب ہوئی۔

اردو شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ دنوں بعد
تک ہمارے یہاں غزل سب سے زیادہ پسندیدہ ذریعۂ اظہار رہی ہے لیکن نظم نگاری
کی بھی کچھ نہ کچھ صورتیں رائج رہی ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہجو، شہر آشوب اور
اس طرح کی دوسری اصناف نظم ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ اسی طرح غزل مسلسل،
قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مسدس، مسمط وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نظم کی
بعض ہیئتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ یہ ہیئتیں زیادہ تر فارسی شاعری سے مستعار تھیں
ان کی پابندیوں کے اندر رہ کر ہمارا شاعر اپنے تخلیقی اور فنی شعور کا اظہار کرتا
تھا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کی شاعری ہر اعتبار سے فارسی شاعری
کا چربہ ہے اس لیے کہ ان منظومات میں بھی اُس عہد کے تہذیبی عوامل کی کارفرمائی
اُس زمانے کا ماحول اور اُس دور کی مخصوص فضا، اس کے مناظر اور اس کی خوبیاں
اُس عہد کے انسان کا کرب اور اُس سماجی نظام پر تنقید ملتی ہے مگر ۱۸۵۷ء
کے بعد یہ تہذیب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ہماری
شاعری بھی بعض تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب لاہور
کی سرکردگی میں آزاد اور حالی نے نئی نظم نگاری کی طرح ڈالی۔ یہ نظم نگاری ان

یہ نئی تھی کہ شاعر کے پاس زندگی کو دیکھنے کے لیے ایک نئے زاویے کی ضرورت تھی اور اس کے مسائل بھی نئے تھے، وہ مغرب سے آئی ہوئی روشنی سے استفادہ کرنا چاہتا تھا اور اپنی شاعری کی رگوں میں نیا خون داخل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شعر و ادب میں تبدیلی کا عمل اچانک نہیں ہوتا اور نہ مزاجوں کو بدلنے کے لیے کسی کو انجکشن دیا جا سکتا ہے۔ مزاج کی تبدیلی اور نئے سانچے کی تشکیل میں مدتیں لگ جاتی ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد اور حالی کی نظم نگاری قصیدہ، مثنوی، قطعہ، ترکیب بند، مسدس اور مخمس کے پرانے سانچوں سے انحراف نہیں کرتی۔ آزاد نے جغرافیہ طبعی کی پہیلی کے عنوان سے بچوں کے لیے ایک بے قافیہ نظم لکھی تھی وہ بھی محض تفنن طبع کے طور پر، اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے دو نظمیں بے قافیہ لکھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوششیں اس وقت ہماری روایت کا جزو نہیں بن سکتی تھیں۔ اس دور کے نظم نگاروں میں حالی کے یہاں جذبے کا وفور سب سے زیادہ ہے اور نظری طور پر وہ قافیے کو شاعری کے لیے لازمی نہیں سمجھتے تھے مگر عملاً انھوں نے نظم نگاری کے مروجہ قاعدوں سے انحراف نہیں کیا۔ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "مجھ کو مغربی شاعری سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغلاق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو۔"[9]

حالی کی قومی شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے والے ان کے

دوسرے ہم عصر شعرا مثلاً اکبرؔ، شبلیؔ، وحیدالدین سلیمؔ اور اُن کے فوراً بعد آنے والی نسل ظفر علی خاں، چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی، تلوک چند محرومؔ، خوشی محمد ناظرؔ، شوقؔ قدوائی، بے نظیرؔ شاہ اور دوسرے شعرا جو حب وطن اور ملّی و قومی آزادی کے جذبے سے سرشار تھے اپنے دور کے پسندیدہ موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے لیکن ان کی نظمیں فنی سانچوں اور اسالیب کے اعتبار سے پرانے طریقوں کے مطابق ہی رہیں۔

فنی سانچوں میں شکست و ریخت کی کوششیں اس دور میں بھی ہوئیں لیکن اس دور کا ادبی مزاج بہت دیر تک ان تبدیلیوں سے مانوس نہ ہو سکا۔ نظم طباطبائی نے پابند نظم میں پہلی بار تھوڑی سی تبدیلی کی۔ گرے کی ایلجی کے ترجمے میں جو انھوں نے "گورِ غریباں" کے عنوان سے کیا ہے بند کا نیا تصور ملتا ہے جو ترکیب بند، ترجیع بند یا مخمس و مسدس کے بند سے مختلف ہے۔ شررؔ نے "دلگداز" میں یہ نظم شایع کی تو اس پر نوٹ لکھا کہ "اس نظم سے اردو میں اسٹینزا فارم شروع ہوتا ہے۔" لیکن یہ اسٹینزا فارم بھی جو اگرچہ چار چار مصرعوں کے قطعے کی ہی ایک صورت تھی اردو میں بہت دنوں تک اجنبی رہا اور اس کو بھی بہت بعد میں قبولِ عام کا درجہ مل سکا۔ شررؔ نے جو اگرچہ ایک شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے اردو میں معرّیٰ یا آزاد نظم (چھوٹے بڑے مصرعوں کے ساتھ) رائج کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ منظوم ڈرامے کے لیے یہ فارم بہت موزوں ہے جہاں برابر کے مصرعے یا قافیے کی پابندی مکالمے کی روانی اور فطری انداز میں حارج ہوتی ہے۔ اس طرح کے کچھ منظوم ڈرامے "دلگداز" میں شایع ہوئے اور بعض شعرا نے ان کا تتبع بھی کیا لیکن ہمارے یہاں جب ڈرامہ ہی نہ پنپ سکا تو منظوم ڈرامہ کیا برگ و بار لاتا! چنانچہ اس طرز میں کامیاب شاعری کا کوئی نمونہ سامنے نہ آسکا۔

اسلوب کی بعض تبدیلیاں مغربی نظموں کے منظوم تراجم کے ذریعے بھی سامنے آئیں۔ شرر نے خود بھی اس طرح کے ترجموں کی ہمت افزائی کی اور سر عبدالقادر نے "مخزن" میں اس پر خاص توجہ دی۔ مخزن کی دیکھا دیکھی اس دور کے دوسرے رسائل میں بھی منظوم ترجمے شائع ہونے لگے لیکن یہ منظوم ترجمے تمام تر انگریزی کے معانی شعرا کی نظموں کے ہیں۔ ترجمے کا چسکا اس زمانے کے شعرا کو ایسا لگا کہ نئے اور پرانے ہر طرح کے شعرا نے اس سلسلے میں طبع آزمائی کی چنانچہ محمد حسین آزاد سے لے کر ظفر علی خاں، عزیز لکھنوی، حسرت موہانی، غلام بھیک نیرنگ، سرور جہان آبادی، احسن لکھنوی، ضامن کنتوری، محمود خاں شیرانی، آسف علی بیرسٹر، تلوک چند محروم، پنڈت دیاترِیہ کیفی، طالب بنارسی، اظہر علی آزاد کاکوروی، اوج گیاوی، میر نذیر حسین انبالوی اور کتنے ہی معروف و نیم معروف شعرا کا کلام اس زمانے کے رسالوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان ترجموں سے یہ تو ضرور ہوا کہ اردو نظم کی فضا اور اس کا منظر نامہ کچھ کچھ بدلا لیکن بالعموم اردو شعرا نے انگریزی کی نظموں کو بھی اردو کے ڈھرّے پر ہی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ورڈز ورتھ یا طامس مور کی نظمیں مثنوی میر حسن یا گلزارِ نسیم کے اقتباسات معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اس دور میں نادر کاکوروی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے ترجموں کے ذریعے اردو نظم کو ایک نیا ذایقہ دینے کی کوشش کی تھی مگر ان کی جوانمرگی کے سبب ان کے فن کے امکانات بروئے کار نہ آ سکے۔

"مخزن" کے دور میں انگریزی نظموں سے ترجمہ اور اخذ و استفادہ کے سلسلے میں جس شاعر نے سب سے زیادہ اپنے تخلیقی جوہر کا ثبوت دیا وہ اقبال ہیں۔ ہم نے اقبال کی قومیت، ملیّت اور ان کے افکار پر اس قدر زور دیا ہے کہ جدید اردو نظم کے مزاج کی تشکیل میں اُن کا جو کارنامہ ہے اس کی طرف ہماری نظر عام طور پر نہیں جاتی مگر واقعہ یہ ہے کہ اقبال

نے ایسی نظم نگاری کو فروغ دینے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ جو حالی، شبلی اور اکبر کی نظم نگاری سے مختلف اور نئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے ہم عصر اور ہم عمر دوسرے شعرا مثلاً ظفر علی خاں، چکبست اور سرور جہان آبادی وغیرہ اس معاملے میں اقبال سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں کیونکہ موخر الذکر شعرا پر یا تو انیس کا پرتو ہے یا حالی و شبلی کا۔ گو اقبال کے یہاں ہیئت میں کوئی بہت بڑا انحراف نہیں ملتا، اُن کی ابتدائی نظموں میں تکرارِ خیال، خطابت اور فنی نشو و نما کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ ان کے یہاں نظم کی فنی تکمیل کی طرف توجہ بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل کی متعدد نظمیں، مثلاً "جبریل اور ابلیس" اور "مسجدِ قرطبہ" وغیرہ فنی تکمیل کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اقبال کی قومی شاعری کے بعد میں بعض اور شعرا نے اس طرح کی نظم نگاری کو اپنے فن کا محور بنایا جس میں سیماب اکبر آبادی، علی اختر حیدر آبادی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی، جمیل مظہری، حامد اللہ افسر، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، اختر شیرانی اور مسعود علی ذوقی وغیرہ ہیں۔ ان میں سے کچھ شعرا نے رومانی نظمیں تو اچھی لکھ بھی لیں لیکن قومی و سیاسی شاعری میں ان کے یہاں گہرائی نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی نے قومی و سیاسی شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی لیکن ان کی نظم نگاری اپنے اسلوب، طریقِ کار اور مزاج کے اعتبار سے پرانی نظم نگاری سے زیادہ قریب اور اقبال کی نظم کے مقابلے میں پس ماندہ ہے۔ وہ مسدس، مثنوی، قصیدہ اور غزلِ مسلسل کے فارم کو توڑ کر آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کی نظموں میں خیال کا نشو و نما اور نظم کی وحدت اور تکمیل کا وہ احساس نہیں ملتا جو اقبال کی دورِ آخر کی نظموں میں ہے۔ حفیظ اور ساغر کی بعض نظموں میں کچھ آہنگ کے تجربے اور نرم زبان استعمال کرنے کا رجحان ملتا ہے لیکن ان کی ایسی نظمیں گیت کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں۔ نظم میں ان کے یہاں پرانا انداز ہی ملتا ہے۔

ہئیت و اسلوب کے سلسلے میں جن شعرا نے اس دور میں تجربہ کرنے کی کوشش کی ان میں سب سے اہم نام عظمت اللہ خاں کا ہے۔ عظمت اللہ خاں غزل کے سخت مخالف تھے اور اس کی گردن بے تکلف ماردینا چاہتے تھے؛ وہ بحروں کو ہندوستانی موسیقی میں ڈھال کر انھیں لچک دار بنانے کے آرزو مند تھے، وہ عربی اور فارسی عروض کے بجائے ہندی پنگل سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ عظمت اللہ خاں نظم کی زبان، اس کے لہجے اور اسلوب میں ہندوستانیت اور ہندی مزاج پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے مجموعہ "سریلے بول" پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ اردو تنقید میں ایک جرات مندانہ قدم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عظمت اللہ خاں نے بعض اچھی نظمیں بھی لکھیں لیکن ان نظموں میں اکہرا پن، ہلکی پھلکی رومانیت اور عنفوانِ شباب کی جذباتیت حاوی ہے اور ان کا لہجہ ضرورت سے زیادہ گیتوں سے مماثل ہوگیا ہے۔ پیچیدہ، گہرے اور علامتی انداز کے لیے ان کے تجربے ہماری روایت پر بہت زیادہ اثر نہیں ڈال سکے گو کہ ان کی نظموں کے مزاج اور ان کی زبان کی نرمی سے آگے چل کر میراجی نے آزاد نظم کے سلسلے میں فائدہ اٹھایا ہے جس کا ایک جگہ انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے عظمت اللہ خاں کو اردو نظم کے ارتقا میں ایک اہم کڑی سمجھنا غلط نہ ہوگا۔

عظمت اللہ خاں کے علاوہ جنگِ عظیم کے بعد اور ۱۹۳۶ء سے قبل جن لوگوں نے مغرب کے اثر سے اردو نظم کو جدید ہئیت یا جدید طریق کار سے آشنا کرنے کی کوشش کی ان میں تاجور نجیب آبادی، میاں بشیر احمد، منصور احمد، حامد علی خاں، عبدالرحمٰن بجنوری، سید ہاشمی فرید آبادی، اختر جونا گڑھی اور اختر شیرانی کا نام بھی لیا جانا چاہیے اگرچہ ان میں سے اختر شیرانی کے علاوہ کسی اور شاعر کو بحیثیت شاعر کوئی نمایاں جگہ نہ مل سکی۔ تاجور نے "مخزن" اور "ہمایوں" کے مدیر کی حیثیت سے نظمِ معرّیٰ کی خاص طور پر ہمت افزائی کی اور

عروض کی سخت گیری کے خلاف عظمت اللہ خاں کی آواز پر لبیک کہا۔ وہ نظم میں عجمی لے کے بھی خلاف تھے اور اس کی زبان اور امیجری کو ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے لیکن تاجور خود ایک کم صلاحیت کے شاعر تھے اور ان کی حیثیت بھی اس سلسلے میں شرر سے زیادہ نہیں ہے۔ میاں بشیر احمد منصور احمد اور حامد علی خاں نے منظوم ترجموں کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے ترجمے "مخزن" کے دورِ اوّل کے مترجموں سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ وہ اردو کی مثنوی یا قصیدے کے طرز پر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ان میں ہیئت و اسلوب کی جدتیں بھی ہیں۔ یقیناً ان اسلوبی جدتوں کا اثر ۱۹۳۶ء والی نسل نے اپنے ذہنی نشوونما کے دور میں قبول کیا ہوگا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اگرچہ چند ہی نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کے اندر شاعرانہ جوہر معلوم ہوتا ہے اور ایک ذہنی اُپج بھی۔ وہ مغرب کی نظم نگاری کے اصول سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کچھ مختصر نظمیں چار چار پانچ پانچ مصرعوں کی اور کبھی کبھی تین تین مصرعوں کی جاپانی ہائی کو کے طرز پر بھی لکھی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ مختصر نظموں کی ابتدا کا سہرا بجنوری ہی کے سر ہے۔ اختر جوناگڑھی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو میں سب سے پہلے سانیٹ لکھنے کا تجربہ کیا۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "لمعات" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ بعد میں اختر شیرانی نے بھی سانیٹ لکھے اور "شہرستان" کے نام سے ایک مجموعہ شایع کیا۔ ن۔م۔ راشد نے بھی اپنے ابتدائی دور میں چند سانیٹ لکھے لیکن سانیٹ ہماری نظم نگاری کی روایت میں اپنی کوئی جگہ نہ بنا سکا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہمارے شاعروں نے ایسے سانیٹ نہیں لکھے جن کو نظم سے الگ پہچانا جا سکے یا اس کے الگ خدوخال متعین کیے جاسکیں۔ صرف تیرہ یا چودہ مصرعوں کی تعداد یا بعض مصرعوں یا قافیوں کی خاص ترتیب بھی کوئی امتیازی صورت نمایاں نہ کر سکی۔ جدید دور میں بھی بعض حضرات نے سانیٹ کا احیاء کرنے کی کوشش

کی لیکن ان کی کوششیں بھی بارآور نہ ہوسکیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں نظم کے اسلوب اور ہیئت میں جو تغیرات ہوئے ان کی طرف ہم نے سرسری اشارے کیے ہیں۔ ان سے بعض نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ ہمارے بعض نظم نگاروں کے یہاں اسلوب و ہیئت میں تبدیلی کی خواہش بہت قوی ہے اور مغرب سے استفادہ کا حوصلہ بھی' لیکن ہماری نظم نگاری فی الجملہ اس رجحان سے زیادہ اثر قبول نہ کرسکی۔ اہمیت پرانے ڈھرے کے قومی' وطنی اور سیاسی شاعروں اور ان کی منظومات کو حاصل رہی اور فنی و لسانی تجربوں کو بے قدری کا شکار ہونا پڑا۔ آج ایسے شعرا سے عام طور پر لوگ واقف نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس دور میں ہیئت و اسلوب میں تبدیلی کی خواہش اپنے زمانے کے فکری یا ذہنی میلان کا زبردست تقاضا نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے پیچھے جذباتی یا نفسیاتی مطالبے کم اور نئی تعلیم کے پروردہ ذہنوں کی ذاتی اُپج کو زیادہ دخل تھا۔ تجربے کرنے والے شعرا میں کئی ایسے تھے جو حقیقی معنوں میں شاید شاعر بھی نہ تھے جیسے شرر یا تاجور۔ بعض ایسے تھے جو بہت اوسط درجے کا ذہن رکھتے تھے۔ بعض ایسے تھے جن کی توجہ بنیادی طور پر ادب کی نثری اصناف کی طرف تھی' انھوں نے شاعری محض منھ کا مزہ بدلنے کے لیے کی ہوگی۔ اس لیے ان تجربوں میں ایک بے دلی کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ سوائے عظمت اللہ خاں کے کسی اور میں اتنا جوش و خروش نہیں ہے۔ ایک اور اہم بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس دور کے شعرا کو ہم عصر انگریزی ادب سے کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی کے جن رومانی شعرا کا کلام انھوں نے اپنے نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا وہی ان کے لیے سرچشمۂ فیضان بنے رہے۔

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی مغرب میں رومانی شعرا از کار رفتہ ہو چکے تھے اور وہاں کی شاعری میں جدید طرزِ احساس اور پیرایۂ بیان کے نئے

سانچے مقبول ہو رہے تھے۔ فرانس میں تو انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہی جدید نظم گوئی اور علامتی طرزِ اظہار کے بے شمار چونکا دینے والے تجربے سامنے آچکے تھے لیکن بیسویں صدی میں ان تجربوں نے پورے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگلستان میں ٹی، ایس، ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ وغیرہ نے جنگِ عظیم کے لگ بھگ انگریزی شاعر کے دھارے کو موڑ دیا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کا اردو شاعر یا تو ان ادبی تحریکات سے ناواقف ہے یا ان سے متاثر ہونے کے لیے اس کے یہاں ذہنی فضا موجود نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء اور اس کے چند سال بعد تک ورڈزورتھ، کیٹس اور بائرن ہمارے اردو نظم نگاروں کے نزدیک دیوتاؤں کی طرح تھے اور جس کسی کو ندرت وجدت کے تمغے سے نوازنا ہوتا اُسے اردو کا ورڈزورتھ، اُردو کا بائرن یا اردو کا کیٹس وغیرہ کہا جاتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر اردو کے نظم نگاروں نے انگریزی کے رومانی شعرا کا بھی بہت سطحی اثر قبول کیا تھا۔ اقبال نے ابتدائی دور میں ان سے نسبتاً زیادہ گہرے اثرات قبول کیے ورنہ اختر شیرانی اور ان کے دوسرے ہم نواؤں کی رومانیت نابالغ ذہنوں کے ہیجان اور ابال، ہلکی پھلکی آرزومندی اور بچکانہ قسم کی شبابیت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ان شعرا کو ورڈزورتھ، شیلی یا کیٹس سے مشابہ قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ انگریزی کے رومانی شعرا اپنے رومانی رویے کے باوجود اپنی شاعری میں ایک فکری حجم رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ہمارے یہاں ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی جو علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری اہم ادبی تحریک تھی۔ اس تحریک کو ابتدا میں کبھی نئے ادب کی تحریک اور کبھی ترقی پسند ادب کی تحریک کہا گیا۔ اس کی ابتدا کرنے والوں میں بعض ایسے نوجوان تھے جو انگلستان میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ نے لندن کے نانکنگ ریستوراں میں بیٹھ کر اس کا خاکہ مرتب کیا۔ اور ایک مینی فیسٹو تیار کیا۔ سجاد ظہیر

اس سے قبل ہندوستان کے دوران قیام میں "انگارے" کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ شائع کر چکے تھے جس میں ان کے علاوہ احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے بھی تھے۔ ان افسانوں پر فرائڈ کے جنسی نظریے کا اثر اور تکنیک میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف وغیرہ کی چھاپ تھی۔ ان افسانوں میں جو بے باکی اور روایت سے انحراف کا رجحان تھا اس نے اردو کے ادبی حلقوں کو خاصا مشتعل کیا تھا اور اس کے خلاف اتنا ہنگامہ برپا ہوا کہ حکومت کو کتاب ضبط کرنی پڑی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ قدامت پرستوں اور روایتی انداز رکھنے والوں کے برخلاف نوجوانوں نے اس کتاب کا بے حد اثر قبول کیا۔ اس کی وجہ غالباً اس دور کے نوجوانوں کا ذہنی اضطراب اور نئی اقدار کی جستجو کا کرب تھا۔ یہ کرب و اضطراب نئے ادبی تجربوں کے لیے زمین ہموار کر رہا تھا، چنانچہ ترقی پسند ادب کے نام سے جب ادب میں روایت سے بغاوت اور نئی دنیا کا خواب دیکھنے اور فرسودہ اقدار کو بدلنے کا نعرہ لگایا گیا تو وہ پوری فضا پر چھا گئی اور نیا ادب اور ترقی پسند ادب اردو زبان میں ایک سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگا۔

فرسودہ اقدار سے بغاوت اور نئی اقدار کی جستجو ہی نئے اور ترقی پسند ادب کا نقطۂ آغاز تھا اور ابتدا میں ہر وہ شخص اس رجحان یا تحریک سے وابستہ سمجھا جاتا تھا جو کسی نہ کسی جہت سے باغی ہونے کا مدعی یا آرزو مند ہوتا تھا اور نئی راہوں کی تلاش اس کا مدعا تھی۔ بعض سیاسی اور سماجی نظام سے باغی تھے، بعض اخلاقی قدروں سے بیزار تھے اور جنسی آزادی ان کی توجہ کا مرکز تھی، بعض زنگ خوردہ ادبی اقدار اور اسالیب سے بیزار تھے اور ان کو توڑ پھوڑ کر اظہار کے نئے سانچے وضع کرنا چاہتے تھے۔ ابتدا میں یہ سب میلانات کبھی ایک ایک ادیب یا شاعر کے یہاں یکجا طور پر، کبھی الگ الگ اور کبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اور گڈمڈ ہوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک نے سیاسی بغاوت اور اشتراکی و عوامی انقلاب کو اپنا بنیادی مسلک قرار دیا

اور اجتماعی فکر اور اجتماعی مسائل کو انفرادی فکر اور انفرادی تجربوں پر فوقیت دی۔ مارکس کے اثر کو تسلیم اور فرائڈ کے اثر کو رد کر دیا۔ انفرادیت کے میلان کو غیر صحت مند اور ہیئت و اظہار کے نئے سانچوں کی جستجو کو فرانس کے زوال پسندوں کی بے راہروی سے تعبیر کیا۔ ترقی پسندی اب جن باتوں سے مشروط قرار دی گئی اس میں شاعری کے لیے وضاحت، صراحت، عوامی اپیل اور مانوس سانچوں کا استعمال زیادہ اہم تھا اس لیے وہ شعرا جو سیاسی اور سماجی سطح پر فرسودہ اقدار سے بغاوت کے علاوہ گھسے پٹے ادبی اسالیب اور سانچوں سے بغاوت کر کے اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے نئے اسالیب اور نئے سانچے وضع کرنا چاہتے تھے وہ ترقی پسند ادب کے دھارے سے الگ ہوتے گئے۔ بعض شعرا نے ادبی حلقوں اور جماعتوں سے وابستگی کو ہی اپنے لیے غیر ضروری قرار دیا لیکن میراجی کی قیادت میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کے نام سے لاہور میں ایک نئی جماعت کی تشکیل ہوئی جس سے وہ نوجوان وابستہ ہوئے جو نئی نظم لکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔

یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ نئے ادب کے دو دھاروں میں بٹ جانے سے نئی نظم بھی اب مکمل طور پر دو دھاروں میں بٹ گئی مگر یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند حلقے میں اب اکّا دکّا شاعر ہی ایسے رہ گئے جو اس تحریک کے سیاسی مسلک کو قبول کرنے کے باوجود اس کے ادبی مسلک سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ فیض اس کی نمایاں مثال ہیں۔ فیض کی نظموں پر انگریزی کے جدید شعرا کا اثر ابتدا ہی سے تھا۔ انھوں نے عوامی شاعری اور وضاحت و صراحت کے پیرایے کو ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں انفرادی طرزِ احساس، داخلی سوز و ساز، ابہام، دھندلکا، پراسراریت، رمزیت، نئے استعارے، نئی تراکیب، نئے امیج اور نئے پیرایۂ اظہار کی جستجو کی وجہ سے ایک نوع کی تازگی کا احساس ہوتا ہے

اور ان کی نظم اقبال اور جوش کے عہد سے بالکل الگ دکھائی دیتی ہے مگر ترقی پسندوں کی اکثریت نے نظم نگاری میں اس پیرایے کو اپنے لیے سب سے زیادہ پسند کیا جس کی امامت جوش ملیح آبادی کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں جوش نظم کی ہیئت اور اسلوب میں اقبال کی نسبت پرانے لگتے ہیں۔ خطابت، لفاظی، تکرار، بے جا طوالت، برہنہ گفتاری، جذباتی اُبال اور اکہرا پن ان نظموں میں ایک فوری اپیل تو پیدا کرتا ہے اور اس طرح کی نظمیں مجموں اور مشاعروں میں بہت مقبول ہوتی ہیں مگر ایسی نظمیں نہ تو گہرائی رکھتی ہیں اور نہ ان کی اپیل دیرپا ہوتی ہے۔ جوش کی نظم کا ایک نمایاں عیب یہ بھی ہے کہ اس کی زبان، لفظیات، علامات و تشبیہات کا ذخیرہ قصیدہ، مرثیہ اور غزل سے مستعار ہے اور ان میں کسی نوع کی تازگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی وہ تمام نقائص ان نظموں میں ملتے ہیں جو قصیدہ، مرثیہ اور غزل نما نظمیہ شاعری میں پہلے ہی سے چلے آ رہے تھے۔ ترقی پسند شاعروں میں مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے بہت سے شعرا کو جوش کے اثر نے خاصا نقصان پہنچایا اور ان کی نظمیہ شاعری کے انفرادی جوہر کو پنپنے کا کم موقع مل سکا۔ غالباً مخدوم ترقی پسندوں میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے آزاد نظم لکھنے کی جرأت کی ورنہ اس وقت تک آزاد نظم کو زوال پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ سردار جعفری نے اپنی ابتدائی نظموں میں کہیں کہیں اقبال سے اثر قبول کیا تھا لیکن خطیبانہ مزاج انھیں بھی جوش ہی کی طرف لے گیا۔ جعفری کی شاعری میں ایک صلابت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر ان کی بہت سی نظمیں بے جا طوالت، تکرارِ خیال و تکرارِ بیان، لفاظی اور جذباتیت کے ابال کی وجہ سے فنی اعتبار سے خام رہ گئیں۔ ابتدا میں وہ بھی آزاد نظم کے مخالف تھے مگر آزادی کے بعد انھوں نے اس فارم کو قبول کر لیا اور اس طرز میں مائکا فسکی،

لوئی آراگاں اور پابلو نرودا وغیرہ کے اثرات کو ملا کر آزاد نظم کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔ جعفری کی آزاد نظم رمزیت و علامت سے دور، وضاحت وصراحت کی ہی شاعری ہے اور اس میں انفرادی تجربے کی آنچ کم اور اجتماعی خیالات کی گونج زیادہ ہے مگر انھوں نے نئی ایمیجری استعمال کر کے اور اپنی نظم کے منظر نامے کو پرانی نظم کے منظر نامے سے الگ کر کے اپنی ایک انفرادیت پیدا کر لی ہے جو دور سے پہچانی جاتی ہے۔ بعد میں ترقی پسند شعرا کی نئی نسل نے اس اسلوب کا خاصا اثر قبول کیا۔ اس طرح کی نظمیں جعفری کے مجموعہ "پتھر کی دیوار" میں شامل ہیں۔

۱۹۵۵ء سے مخدوم کی نظم نگاری ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ یہ نظمیں داخلیت اور خارجیت، وضاحت اور ابہام کے انوکھے امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اس لیے ان میں سے اکثر نظمیں فنی تکمیل کا بھی احساس دلاتی ہیں اور ان میں مخدوم کا انفرادی اسلوب نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مخدوم اور جعفری کے علاوہ دوسرے شعرا اپنی انفرادی طرز کو کبھی نہ پا سکے اور ان کی بیشتر نظمیں نئی نظم کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اکا دکا کوئی نظم ایسی مل جاتی ہے جو اپنی کسی ایک خصوصیت کی وجہ سے قابلِ توجہ کہی جائے گی اور اسے انتخابات میں جگہ ملا کرے گی۔

اردو نظم کو قصیدہ، مرثیہ، قطعہ اور غزلِ مسلسل کے فرسودہ سانچوں اور اس کی گھسی پٹی لفظیات اور ایمیجری سے آزاد کر کے ایک نیا آہنگ دینے اور اسے نئے ذائقوں سے روشناس کرانے کا سہرا جن شعرا کے سر ہے وہ راشد اور میراجی ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں تصدق حسین خالد اور ڈاکٹر تاثیر نے بعض ابتدائی کوششیں کی تھیں لیکن خالد اور تاثیر کے یہاں داخلی تجربے کی کمی اور تخلیقی شدت کے فقدان کا احساس ہوتا ہے اس لیے ان کی نظمیں نئے ذہن کے نفسیاتی اور جذباتی تقاضوں کو آسودہ نہیں کر پاتیں۔ ان

شعرا کا سرمایہ قلیل ہے، ان کے انفرادی طرز کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکا۔ راشد اور میراجی نے اپنی نظم کے ذریعے نئی ہیئت اور فنی تکمیل کے شعور کو عام کیا۔ آزاد نظم انھیں دونوں شعرا کے ہاتھوں اپنی معنویت اور افادیت کو آشکار کرتی ہے۔ راشد انگریزی کے جدید شعرا سے متاثر ہیں اس لیے ان کے یہاں پُر اسراریت کم ہے اور ان کی علامتیں ایک حد تک واضح ہوتی ہیں مگر میراجی کا سرچشمۂ فیضان زیادہ تر فرانسیسی اور امریکی شعرا رہے ہیں۔ ان شعرا پر انھوں نے بڑے اچھے تعارفی مضامین لکھے اور ان کی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میراجی اپنے مزاج اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے فرانس کے جدید نظم نگاروں سے گہری مماثلت رکھتے ہیں اس لیے ان کی نظمیں اردو نظم کے سرمائے میں ایک چونکا دینے والا تجربہ تھیں۔ ابتدا میں ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ کچھ تو ان کی جنسی مسائل کے ساتھ ضرورت سے زیادہ وابستگی کی وجہ سے اور کچھ ابہام اور پُراسراریت کی وجہ سے۔ یہ ابہام اس لیے اور بھی زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا کہ اردو نظم کی روایت میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ آزاد تلازمۂ خیال، شعور کی رو، خارجی اور منطقی ربط کے بجائے داخلی اور اندرونی ربط، نجی علامتوں کا استعمال۔ یہ سب چیزیں اردو نظم کے لیے انوکھی تھیں۔ مگر میراجی کی مخالفت کے باوجود ان کا اثر نوجوان نظم نگاروں پر بہت قوی رہا۔ میراجی کی پابند نظموں میں بھی یہی علامتی اسلوب اور نئی فضا کی تخلیق ملتی ہے۔ آگے چل کر آزاد اور پابند دونوں طرح کی نظموں پر میراجی کی روایت کا اثر ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض شعرا نے اپنے انفرادی طرزِ احساس اور اپنے شخصی تجربوں کی نوعیت سے اس دائرے کو وسیع اور کشادہ کیا۔ پُراسراریت اور دھندلکا کم اور رمزیت اور علامتی اسلوب زیادہ بھرپور معنویت کے ساتھ سامنے آئے۔ مختار صدیقی، ضیا جالندھری،

مجید امجد، اختر الایمان، منیب الرحمٰن، حامد عزیز مدنی اور دوسرے شعرا نے اس طرز کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور اسے جدید طرزِ احساس سے مکمل طور پر ہم آہنگ کیا۔ یہ سب شعرا نظم میں فنی تکمیل کے قائل ہیں۔ ان کی نظموں میں خیال کا ارتقا اور موضوع و مواد کی اسلوب، آہنگ اور لہجے سے فطری اور ناگزیر مطابقت خاصی حد تک نمایاں ہے۔ میراجی کے حلقے سے وابستہ بعض شعرا ہیئت کے تجربوں کے سلسلے میں فیشن اور فارمولے کا بھی شکار ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تخلیقی جوہر اور انفرادی احساس کی کمی تھی۔ انھوں نے نئی ہیئت کی جستجو کسی نئے کرب یا نئے جذبے اور تجربے کے اظہار کے لیے نہیں کی تھی بلکہ محض نئے بننے کے شوق میں۔ اس لیے ان میں سے بیشتر کی نظمیں اسلوبی چٹکلوں سے زیادہ آگے نہ جا سکیں مگر ان نظموں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نظم نگاری میں نئے تجربوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے ناتراشیدہ اور ادھورے سانچوں سے آگے چل کر فائدہ اٹھایا گیا۔ اگر شعوری طور پر ایسا نہ بھی ہوا ہو تو یہ پیرایہ ہائے اظہار آہستہ آہستہ نئی نظم کی روایت میں شامل ہوتے گئے۔ نظم کو غزل نما شاعری سے الگ کرنے میں ان تجربوں نے ایک مؤثر قوت کا کام کیا ہے۔

۱۹۵۵ء کے لگ بھگ اردو نظم نگاروں کی ایک اور نئی نسل سامنے آتی ہے۔ یہ نسل ان نوجوانوں کی تھی جنھوں نے آزادی اور تقسیم کی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ دور برِصغیر ہند و پاک میں تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی شکست اور پامالی کا دور ہے۔ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش، خوش آئند مستقبل کا خواب، جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریکوں پر یقین کا طلسم ایک ایک کرکے بکھرنے لگا۔ مینی فسٹو، اعلان نامے، طے شدہ راستوں پر چلنے اور چل کر اپنی منزلِ مراد تک پہنچنے کے دعوے بے معنی اور بے سود نظر آنے لگے۔ نیکی اور بدی، جھوٹ اور سچائی، محبت اور نفرت،

خلوص اور عدم خلوص کے نئے بنائے پیمانے بیکار نظر آنے لگے۔ یہ کیفیت ایک طور پر عالمگیر کہی جا سکتی ہے اور انسان کے موجودہ المیہ اور کرب کے پیچھے اس طرح کے ہزارہا اسباب و عوامل ہیں۔ مغرب میں اگر سائنسی اور صنعتی تہذیب کی حشر سامانیاں ہیں تو ہمارے یہاں آزادی، جمہوریت، مساوات، رواداری، انسانیت، سماجی روابط اور اس طرح کی دوسری حقیقتوں کی بے حرمتی ہے۔ اس کیفیت نے اردو نظم کو بھی متاثر کیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو رجحان ابھر کر سامنے آیا ہے وہ نظم میں شخصی طرزِ احساس اور انفرادی زاویۂ نظر پر اصرار کا ہے۔ طے شدہ موضوعات، طے شدہ نقطۂ نظر طے شدہ نتائج تک پہنچنے کی پابندی، طے شدہ فنی طریقوں یا اسالیب سے وفاداری، ان سب کی نفی اور ان سے انحراف و انقطاع کا عمل اس دور میں تیز ہوا ہے۔ یہ عمل ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق والوں کے یہاں انفرادی طور پر بعض شعرا کے یہاں پہلے بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا لیکن اب اس نے اپنے دور کے غالب میلان اور رویے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لیے اس دور میں گزشتہ دور کے بعض قابلِ قدر شعرا کو ازسرِنو پڑھنے اور ان کی معنویت کو ابھار کر ان کی روایت سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں گروہوں کے متعلق یہ ردِ عمل ظاہر کیا گیا کہ دونوں کے یہاں کسی نہ کسی طور کی فارمولا بازی اور شاعری سے متعلق کچھ طے شدہ طریقوں کا استعمال ملتا ہے۔ اگر ترقی پسند موضوع اور مواد کو ترجیح دیتے ہیں تو حلقے والے ہیئت اور اسلوب کو۔ اگر اول الذکر اجتماعی زندگی اور اجتماعی مسائل کا ایک الگ خانہ بناتے ہیں تو موخر الذکر انفرادی اور داخلی احساس اور تجربے کو اجتماعی زندگی سے منقطع کر کے انفرادیت پسندی یا داخلیت پرستی کا ایک حصار بنائے ہوئے ہیں۔ نئے شاعر نے

ان دونوں طریقوں کو مصنوعی اور فرضی قرار دیا اور شعری عمل میں مواد اور ہیئت کے ناگزیر اور نامیاتی تعلق اور وحدت کو تسلیم کیا اس لیے نئی نظم اب نہ صرف نئے مواد سے جنم لے گی اور نہ محض نئی ہیئت یا نیا اسلوب اوپر سے عاید کرنے کی کوشش کی جائے گی بلکہ نیا طرزِ احساس، اور نیا رویہ خود نئی حقیقت اور نئے مواد کو جنم دے گا اور نیا مواد اپنے تخلیقی عمل کے نتیجے میں نئی ہیئت اور نئے اسلوب کی تشکیل کرے گا۔ گویا ۱۹۳۶ء والے شعرا کے یہاں نئی نظم یا نئی شاعری کا جو تصور مقبول اور رائج تھا اس میں یا تو نئے کا تعلق محض عصری مسائل اور عصری مواد سے مشروط تھا یا نئی ہیئت اور نئے اسلوب کا تجربہ کرنے کو نئی نظم سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ نئی شاعری کے یہ دونوں تصورات اس اعتبار سے ناقص تھے کہ نئے یا جدید کا عصری اور زمانی معیار مقرر کیا جائے تو یہ شاعری موجودہ دور کے گزر جانے کے بعد پرانی ہو جائے گی کیونکہ آنے والا زمانہ نئی حقیقت اور نئے مسائل کو جنم دے گا۔ دوسری طرف اگر نئی ہیئت اور نئے اسلوب کو پیمانہ بنایا جائے تو یہ نئی ہیئت اور نیا اسلوب بھی آگے چل کر پامال اور فرسودہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ پر نئی ہیئتیں اور نئے اسالیب جنم لیں گے۔ اس وقت آج کی نئی اور تجرباتی شاعری روایتی اور پرانی شاعری کہلائے گی۔ ظاہر ہے کہ ادب میں نئے پن کا یہ تصوّر ایک طرح سے صحافتی اور ہنگامی نوعیت کا ہے۔ اس کا ادب کے بنیادی تخلیقی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر ادبی تخلیق ایک زندہ اور قایم رہنے والا جمالیاتی فن پارہ ہے۔ وہ اگر مواد اور ہیئت کے ناگزیر اور فطری انضمام سے وجود میں آتا ہے تو وہ زندہ اور نیا ہوتا ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے، اس کو کسی عہد میں منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم نئی نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی پرانی نظم کا اعادہ یا تکرار نہیں ہے۔

اعادہ یا تکرار مشینی یا میکانکی عمل ہے جیسے ایک صنّاع ایک بنے بنائے سانچے سے ایک طرح کی چیزیں ڈھالتا جائے۔ مگر تخلیقی عمل اعادہ نہیں ہوتا یعنی جب کوئی نیا تجربہ یا کیفیت شاعر کو نظم لکھنے پر آمادہ کرتی ہے تو تخلیقی عمل اس کے لیے نئی صورت یا ہیئت مہیا کرتا ہے اس طرح نظم کو ایک نئے وجود کی حیثیت مل جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ہر تخلیق دوسری تخلیق کی نسبت سے نئی ہوگی یعنی اس سے الگ اپنے وجود کو تسلیم کرائے گی۔ ایک شاعر کی فنی تخلیق دوسرے شاعر کی فنی تخلیق سے اور خود ایک شاعر کی ایک نظم اسی شاعر کی دوسری نظم کے مقابلے میں اپنا الگ وجود رکھے گی تو نئی ہوگی ورنہ نہیں۔

نئی نظم اور نئی شاعری کے اس تصور نے جس رجحان کو تقویت دی ہے وہ تحریک، حلقے، گروہ یا جماعت کی نفی کرتی ہے اور اس کے وسیلے سے پہچانی جانے والی شاعری سے مختلف ہے۔ یعنی نئی شاعری یا نئی نظم لکھنے والوں کا کوئی ایسا حلقہ یا جماعت نہیں ہے جس سے وابستگی یا جس کی رُکنیت کسی شاعر کو نیا کہلانے کا موجب بن سکے یا اس حلقے میں ایک بار داخل ہو کر شاعر کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اب اسے نئے شاعر ہونے کی سند مل چکی ہے اور یہ اعزاز اس سے کبھی چھینا نہ جا سکے گا چاہے اس کی تخلیقات کی جو بھی سمت یا معیار ہو۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق والوں کے یہاں یہ تصور موجود تھا یعنی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے پر شاعر ترقی پسند کہلاتا تھا اور اس کی ہر نظم ترقی پسند ادب کا نمونہ سمجھی جاتی تھی یہی حال حلقے والوں کا تھا، حلقے سے وابستگی شاعر کو جدید یا نیا بنانے اور ہمیشہ نیا بنائے رکھنے کی ذمہ دار تھی۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیانی دور میں بھی اگر کچھ شاعروں نے نئی شاعری کے رسمی یا غیر رسمی حلقے بنانے کی کوشش کی ہے تو وہ طبعاً ترقی پسند

تحریک یا حلقۂ اربابِ ذوق سے موروثی تعلق رکھتے ہیں یا ان کے باقیات کے طور پر نئی نسل کے درمیان موجود ہیں۔ کچھ یہی حال فیشن کے طور پر نئی شاعری کرنے والے بعض شعرا کا ہے۔ ایسے لوگوں سے کسی دَور میں مفر نہیں۔

۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان کے شعرا کی نمایاں خصوصیت تنوع، رنگا رنگی اور پہلوداری ہے۔ نئی شاعری اب آزاد نظم کے مترادف نہیں سمجھی جاتی نہ اس کی متعین اور سکہ بند ہیئت ہے اور نہ اس کا بندھا ٹکا اسلوب۔ پابند، نیم پابند، معریٰ، آزاد ہر طرح کے اسالیب میں نئی جہتیں پیدا ہوئی ہیں اور نئی حسیت نے ان میں تازگی پیدا کی ہے۔ نئی پابند نظم پرانی پابند نظم کے درمیان اپنے ذائقے، اپنی خوشبو اور اپنے لہجے سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یہی حال دوسری طرح کی نظموں کا ہے۔ سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ اب نئی نظم نے غزل، قصیدہ، مرثیہ اور خطابیہ شاعری کی گھسی پٹی لفظیات سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے۔ نئی علامتیں، الفاظ کے نئے تلازمے، نئے امیج، نیا منظر نامہ اور نئی فضا کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ مختصر نظموں نے اس دور میں خاص طور سے اپنے معنی خیز امکانات کو ابھارا ہے اور بعض شعرا نے اس پیرایۂ اظہار میں بڑی نوک اور دھار پیدا کی ہے۔ بظاہر سادہ اور ہلکے پھلکے انداز میں بلیغ اور دوررس تجربات کو نازک اور کم سے کم الفاظ میں ابھارنے کا ہنر ان نظموں کے ذریعے سامنے آیا ہے۔ مختصر نظمیں پہلے بھی لکھی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے بعد کے دور میں محمود جالندھری اور عظیم قریشی کو اس سلسلے میں اوّلیت حاصل ہے لیکن ان شعرا کی مختصر نظمیں آزاد قطعے کی حیثیت رکھتی تھیں، ان کی معنویت محدود تھی اور اظہار میں وہ تازگی نہیں تھی جو آج کے شعرا کے یہاں ہے۔ اس باب میں منیر نیازی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعد کے شعرا نے منیر نیازی کی روایت کو کچھ نئے عناصر سے آمیز کرکے مختصر نظم کو نئی سمت دی ہے۔

اس دہائی کے شعرا کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ۱۹۳۶ء والی نسل کے بیشتر شعرا کی طرح ایک ایک دو نظموں کے شاعر نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر شعرا کی ساری نظمیں قابلِ توجہ اور یکساں اہمیت کی حامل ہیں ان سب کا مطالعہ کیے بغیر اس دور کی شاعری کے تنوّع کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اس لیے یہ انتخاب مرتب کرتے وقت سب سے زیادہ دشواری اسی دور کے شعرا کے سلسلے میں ہوئی۔ جتنے شاعر اس انتخاب میں شامل ہیں اس سے کہیں زیادہ چھوڑ دینے پڑے اور جن شعرا کی نظمیں شریک کی گئیں ان کے متعلق بھی یہ فیصلہ دشوار تھا کہ کون سی نظمیں شامل کی جائیں اور کن نظموں کو نظر انداز کیا جائے۔

اس انتخاب کی ترتیب میں اپنی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہ نئی نظم کے خدوخال کو پہچاننے میں مدد دے سکے۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن اور ڈاکٹر وحید اختر کا بے حد شکرگزار ہوں جن کے مشوروں کے بغیر اس انتخاب میں یہ جامعیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

۳۳۔ ذاکر باغ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

نظمیں

تصدق حسین خالد

کتبہ

شیردل خاں!
میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے، مسلسل ذلتیں
جنگ،
رونٹ،
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں،
آفتابِ مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی
آف ــــ کنوارا ــــ کیا کہوں ــــ

حسنِ قبول

گرج رہا ہے سیہ مست پیل پیکر ابر
اُداس کوہ کی چوٹی پہ ایک تنہا پیڑ
اٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ
سرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا بے کس ہاتھ
ہجومِ یاس میں اک آخری دعا کے لیے

"برس محیطِ کرم! ایک بار اور برس
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے
تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں سازِ برگِ نمو
یہ میری کلیاں، یہ پتے ——
ابھی تو زندہ ہوں
اُتر اُتر مرے دامن پہ پھول برسا دے"
بچل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا
دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا
شرارِ برق کا ہیجان
پیڑ —— طور بدست
ز فرق تا بقدم ایک پھول
حسنِ قبول!

ایک شام

پہاڑ کی بلندیوں سے
بڑھتے سائے
گرتے آ رہے ہیں
شام کی فسردگی میں
ایک سرخ ڈور سی، افق کی
جھلملا رہی ہے

وادیوں میں
اک اداس راگنی کی گونج سی لپک گئی
برہ کی آگ
نغمہ بن کے جاگ اٹھی
افق کی ڈور ٹوٹ کر
کسی عمیق غار کی سیاہیوں میں کھو گئی
اداس راگنی کی گونج
چیخ بن کے رہ گئی

محمد دین تاثیر

لندن کی ایک شام

یہ رہگذر
یہ زن و مرد کا ہجوم، یہ شام
فرازِ کوہ سے جس طرح نمایاں سر پہ
لیے ہوئے، شفق آلود برف کے پیکر
سفید جھیل کی آغوش میں سمٹ جائیں
یہ تند گام، سبک سیر کاروانِ حیات
"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"
کدھر سے آئے، کدھر جا رہے ہیں کیا معلوم ---!

سنہری شام
یہ "ایروس*" جھلملاتا ہوا
بندھا ہوا ہے نشانہ، کھنچی ہوئی ہے کماں
کسے یہ تیر لگے گا
کہاں؟ یہاں کہ وہاں ---!
نظر نظر سے ملی دل کا کام ختم ہوا

سنہری شام
یہ "ایروس" جگمگاتا ہے

* عشق کے دیوتا کا مجسمہ

کوئی ہنسے، کوئی روئے یہ مسکراتا ہے
اسی مقام پہ پھر لوٹ کر میں آیا ہوں
یہ رہگزر، یہ زن و مرد کا ہجوم، یہ شام
یہ تند سیر، سبک گام کاروانِ حیات
یہ جوشِ رنگ، یہ طغیانِ حسن کے جلوے
یہیں کے نور سے روشن مری نگاہیں تھیں
مرے شباب کی روندی ہوئی یہ راہیں ہیں
وہی مقام ہے لیکن وہی مقام نہیں
یہ شام تو ہے مگر وہ سنہری شام نہیں
وہ رعب داب نہیں ہے
وہ دھوم دھام نہیں
وہ میں نہیں ہوں ——
کہ اُن کا میں اب غلام نہیں
صنم کدوں میں اجالے نہیں رہے کہ جو تھے
کہ اب وہ دیکھنے والے نہیں رہے کہ جو تھے

سائے

ایسی راتیں بھی کئی گزری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے

ہر گنہ سامنے آجاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلۂ تیشہ کاری
نہ [redacted] قرار

[redacted] گزری مجھ پر
جب تری راہگذر میں سائے
ہر جگہ چار طرف سے چھائے
کبھی آئے، کبھی بھاگے
کبھی بھاگے، کبھی آئے
تو نہ تھی، تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے رقصاں
میں نہ تھا، میری طرح کے سائے

سائے ہی سائے تھے لرزاں لرزاں
سائے ہی سائے، تری راہگذر کے سائے

ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری یاد نہیں آئی ہے

فراق گورکھپوری

آدھی رات

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اب اتھاہ گمشدگی
اک ایک کرکے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں — جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

(۲)

تمولیوں کی دکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگھار کا پیڑ
دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
یہ موج نور، یہ بھرپور، یہ کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول
سپاہ روس ہے اب کتنی دور برلن سے؟

جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو
چھلک رہی ہے خُمِ غیب سے شرابِ وجود
فضائے نیم شبی، نرگسِ خمار آلود
کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

(۳)

یہ رس کی سیج، یہ سنگار، یہ سکوتِ گات
نین کمل کی جھپک، کام روپ کا جادو
یہ رسمسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں
فلک پہ بکھرے ہوئے چاند اور ستاروں کی
چمکتی انگلیوں نے چھیڑے سازِ فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں، تم بھی جاگ اٹھو

(۴)

شعاعِ ماہ نے یوں ان کو چوم چوم لیا
ندی کے بیچ کُمُدنی کے پھول کھل اٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی
حنا کی ٹٹیوں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنسناہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہوگی

(۵)

یہ محوِ خواب ہیں رنگین مچھلیاں تہِ آب
کہ حوضِ صحن میں اب ان کی چشمکیں بھی نہیں

یہ سرنگوں ہیں سرِ شاخ پھول گڑہل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں
یہ چاندنی ہے کہ اُمڈا ہوا ہے رس ساگر
اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں

(۶)

قریب چاند کے منڈلا رہی ہے اک چڑیا
بھنور میں نور کے کروٹ سے جیسے ناؤ چلے
کہ جیسے سینۂ شاعر میں کوئی خواب پلے
وہ خواب سانچے میں جس کے نئی حیات ڈھلے
وہ خواب جس سے پرانا نظامِ غم بدلے
کہاں سے آتی ہے مدمالتی لتا کی لپٹ
کہ جیسے سیکڑوں پریاں گلابیاں چھڑکائیں
کہ جیسے سیکڑوں بن دیویوں نے جھولے پر
ادائے خاص سے اک ساتھ بال کھول دئے
لگے ہیں کان ستاروں کے جس کی آہٹ پر
اس انقلاب کی کوئی خبر نہیں ہوتی
دلِ نجوم دھڑکتے ہیں کان بجتے ہیں

(۷)

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات، یہ شبِ ماہ
یہ پُرسکوں، یہ پُراسرار، یہ اُداس سماں
یہ نرم نرم ہواؤں کے نیلگوں جھونکے
فضا کی اوٹ میں مُردوں کی گنگناہٹ ہے
یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے

دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ
خنک دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ
ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن
حیات پردۂ شب میں بدلتی ہے پہلو
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا
مرے خیال میں اب ایک بج رہا ہوگا

(۸)

گلوں نے چادرِ شبنم سے منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں
سکوتِ نیم شبی ہے انھیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

(۹)

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
نئے ستارے، نئی گردشیں، نئے دن رات
زمیں سے تا بہ فلک انتظار کا عالم
فضائے زرد میں دھندلے غبار کا عالم
حیات موت نما انتشار کا عالم
ہے موجِ دود کہ دھندلی فضا کی نبضیں ہیں

تمام خستگی و ماندگی یہ دورِ حیات
یہ سرد سرد یہ بے جان پھیکی پھیکی چمک
نظامِ ثانیہ کی موت کا پسینہ سے ہے
خود اپنے آپ میں یہ کائنات ڈوب گئی
خود اپنی کوکھ سے پھر جگمگا کے ابھرے گی
بدل کے کینچلی جس طرح ناگ لہرائے

(۱۰)

خنک فضاؤں میں رقصاں ہیں چاندنی کرنیں
کہ آبگینوں پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار
یہ موجِ غفلتِ معصوم، یہ خمارِ بدن
یہ سانس نیند میں ڈوبی، یہ آنکھ مدماتی
اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

شاد عارفی

مشورہ

مانتی ہوں سہروں کے پھول آپ کھلتے ہیں
اور "بر" زمانے میں بن تلاش ملتے ہیں
کاہلی کی مسند سے باپ بھی تو ہلتے ہیں
گھر پہ آ کے قسمت کیوں دے صدا کہ حاضر ہوں

تم پہ ہے "بڑی" اب تک بن بیاہ بیٹھی ہے
دیکھتی ہے کنبے کی رسم و راہ بیٹھی ہے
پاک دامنی سے ہے داد خواہ، بیٹھی ہے
مجھ پہ ہو تو بول جائے اس کو ہاتھ پکڑا دوں

بختیار کی نانی، کون تھی؟ پسنہاری
احتشام کی دادی؟ حسن بام بازری
خاندانِ رشدی تھا مرکز غلط کاری
چھان بین — اور ایسی چھان بین ہائے ہوں

باپ میرے ادھر کچھ میل، اور ماں ادھر کھوٹی
یہ زکوٰۃ کا پیسہ، وہ حرام کی روٹی
اس کی آبرو ڈبلی، اس کی بے کسی موٹی
اونچ نیچ کی بابت سوچ لو کہ "منتی ہوں"

لڑکیوں کی دشمن ہے، دوپہر جوانی کی
ولولوں پہ کھلتی ہے آنکھ پاسبانی کی
نوکروں پہ ہوتی ہے مشق دلستانی کی
"مشورے" میں دل کی بات کیوں زبان پر رکھوں

کل فلاں فلاں لڑکی نام اچھال کر چل دی
انتہا پہ ہر تتلی پر نکال کر چل دی
"رکھ رکھاؤ" کے سر پر خاک ڈال کر چل دی
اور کیا مثالیں دوں، اور کیا حوالے دوں

جانتے ہو پردے کا گھر ــــ قفس نہیں ہوتا
"اونچ نیچ" کا کھٹکا سو میں دس نہیں ہوتا
دس میں پانچ وہ لچھن جن پہ بس نہیں ہوتا
نقلِ کفر کے اندر کفر کب سمجھتی ہوں

تم ہو، دوسرا کوئی اس طرح اگر کہتا
"سوئے ظن" کا خمیازہ سطحِ فرش پر بہتا
حملۂ حمیت پر مارتا کہ مر رہتا ــــ
مجھ سے ہو نہیں سکتا حرفِ ناسزا سن لوں

نظمِ خانہ داری میں آج تک کبھی ٹوکا؟
صرفِ جا و بے جا پر میں نے کب تمھیں روکا؟
سائرہ کا رشتہ ہے واسطہ من و تو کا
تم زمیں پہ چلتی ہو، میں ہوا میں اڑتا ہوں

غیر کُف میں شادی کا سلسلہ نہ مانوں گا
اب وحد کو پھٹکوں گا، نسل و قوم چھانوں گا
پاک صاف "ہڈی" کو پاک صاف جانوں گا
شجرہ اسے ساقط کو کیا "صلوٰۃ نسبت" دوں

آج سے "بڑی" تنہا باغ میں نہ جانے پائے
جس میں "آہ" شامل ہو وہ ہوا نہ کھانے پائے
وہ تو وہ سلیمہ بھی ڈھول پر نہ گانے پائے
نوجواں گوالا بھی گھر میں اب نہ آئے، کیوں جی!

کیا.....؟ "بڑی" کو پندرہ دن ہوگئے بخار آتے
کام کاج سے بچتے، ناشتے سے کتراتے
اور کچھ مرض ایسے جو کہے نہیں جاتے
روگ نے جڑیں پکڑیں، اب حکیم بلوا دوں؟

ہمتیں بڑھاتا ہے ہر طبیب اخلاقاً
"طبِ یوسفی" یہ ہے اور طاق پر "مخزن"
دق نہیں تو نسخے میں کاسنی کا کیا کارن
نبض کے برے لچھن، تھامنا — میں گرتی ہوں

دق سے موت ہے اِس جا "احتیاط کرداری"
فرد فرد قصّے پر شدّتِ نگہداری
(جو نماز پڑھتا ہے وہ کرے نہ میخواری)
پھر یہ عصمتیں لاکھوں ہو رہی ہیں اغوا کیوں؟

شوفر

کھٹ ۔ ۔ کھٹ ۔ ۔ ۔ کون ؟ صبیحہ ! کیسے ؟ یوں ہی کوئی کام نہیں
پچھلی رات ۔ ۔ بھیانک ٹریجڈی —کیا کچھ ہو انجام ——۔ نہیں
میرا ذمہ —— میں بھگتوں گی —— تم پر کچھ الزام —— نہیں

ہم ہیں اس اخلاق کے پیرو، ہم ہیں اس تہذیب کے لوگ
جس میں عفت اک "نفر دینہ" عصمت جس میں "ذہنی روگ"
جذبوں پر پہرے بٹھلانا کیا "سودائے خام" نہیں؟

وہ بچوں کے باپ —— تو کیا ہے؟ "دل کا ہر انسان جوان"
تم بھی ایسے بن جانا جیسے "منجھلے بھائی جان" ——
سالی اور سلہج پر لٹو، بیوی سے "کلام نہیں"

ان سے ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ تہذیب میں اونچی، چھوٹے بھائی سے وقتی چاہ
شوہر آئے نہ آئے لیکن دیور کی "تکتی ہیں راہ"
خواہش کی تکمیل بھی جاری، "شادی بھی ناکام نہیں"

نوکر اور نمک اور مذہب —— ان تاویلوں سے باز آؤ
مردوں کی ایسی نیکی پر آجاتا ہے مجھ کو تاؤ
عورت کے ہونٹوں پر چھپتا اب مقبولِ عام نہیں

ہفتہ بھر میں اک دن "ایسی لغزش" کوئی عیب نہیں
ظاہر ہے پاپا ممی کو حاصل "علمِ غیب" نہیں
کالی راتوں کی باتوں سے واقف صبح وشام نہیں

جاتی ہوں، گھبرائے کیوں ہو؟ کیا اندھیاری گھور نہیں؟
دو دل راضی کے بارے میں قاضی کا کچھ زور نہیں
لو — یہ دس کا نوٹ — تمھاری "اُجرت" ہے "انعام" نہیں

اختر انصاری

جبرِ حیات

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے ہمدم!
تجھے بھی دل سے بھلاؤں، میں خود کو بھی بھولوں
اڑوں لگا کے تخیل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر، ستاروں کو چھولوں
مچاؤں دھوم کبھی کہکشاں میں، اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں
بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاضِ انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں
مگر اڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں
بلندیوں سے گروں گا تو کیا کروں گا میں

ایک ستارہ

ایک طوفانی، بھیانک، سخت کالی رات ہے
دہر پر چھائی ہوئی
کوئی ناگن جیسے بل کھائی ہوئی
موت جیسے سر پہ منڈلائی ہوئی
دہر پر چھائی ہوئی
روحِ انسانی کو لرزا دینے والی رات ہے

وسعتِ افلاک پر ہیں چار سو چھائے ہوئے
بادلوں کے دَل کے دَل
جیسے بھوت آئیں بیاباں سے نکل
جیسے سایہ ڈال دے اپنا اجل
بادلوں کے دَل کے دَل
رفعتِ افلاک پر ہیں چار سو چھائے ہوئے

ٹمٹماتا ہے فلک پر اس بھیانک رات میں
اک ستارہ ہائے ہائے
ایک ننھا سا شرارہ ہائے ہائے
ایک نازک برق پارہ ہائے ہائے
جھلملاتا ہے فلک پر اس بھیانک رات میں

دیکھنا یارو یہ گردوں کا سہارا تو نہیں
یہ ستارہ اپنی قسمت کا ستارا تو نہیں

اسرار الحق مجاز

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ رو پہلی چھاؤں، یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون سمجھے کون جانے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے
کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے منھ پھاڑے
زندگی، خاک و خون میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لیے
دو گھڑی خود کو شادماں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے
چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے روحِ بربادی
بربریت کے کاروانوں سے
زلزلے میں ہے سینۂ گیتی
ذوقِ پنہاں کو کامراں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے
ایک پیمانۂ مئے سرجوش
لطفِ گفتار، گرمیِ آغوش
بوسے — اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش
روحِ یخ بستہ ہے تپاں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار

کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

پھر کہاں یہ حسیں سہانی رات
یہ فراغت، یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ جمال
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات

آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

احسن جذبی

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا احساس، پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار مری عرضِ وفا سے بیزار

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مرا سحر، وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گالوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤ! تم نے تو بے کار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

ن۔ م۔ راشد

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت —— اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں
اُن میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اِس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انھیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منھ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے سوگوار
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو،
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب گہ سے لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری

جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اُس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوٹے و بام کو
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی

کون سی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

لب بیاباں، بوسے بے جاں
کون سی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم
جسم کی یہ کارگاہیں
جن کا ہیزم آپ بن جاتے ہیں ہم

نیم شب اور شہر خواب آلودہ، ہمسائے
کہ جیسے دزدِ شب گرداں کوئی
شام سے تھے حسرتوں کے بندۂ بے دام ہم
پی رہے تھے جام پر ہر جام ہم
یہ سمجھ کر، جرعۂ پنہاں کوئی
شاید آخر ابتدائے راز کا ایما بنے

مطلب آساں، حرف بے معنی
تبسم کے حسابی زاویے
متن کے سب حاشیے
جن سے عیشِ خام کے نقشِ ریا بنتے رہے
اور آخر جسم میں بُعدِ سرِ مُو بھی نہ تھا
جب دلوں کے درمیاں
حائل تھے سنگیں فاصلے

قربِ چشم و گوش سے
ہم کون سی اُلجھن کو سلجھاتے رہے؟

کون سی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم
شام کو جب اپنی غم گاہوں سے دزدانہ نکل آتے ہیں ہم
زندگی کو تنگنائے تازہ تر کی جستجو
یا زوالِ عمر کا دیوِ سبک پا روبرو
یا انا کے دست و پا کو وسعتوں کی آرزو
کون سی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

سبا ویراں

سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
سبا آلام کا انبارِ بے پایاں
گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقارِ زیرِ پر
تو سرمہ در گلو انساں
سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

سلیماں سر بہ زانو، ترش رُو، غمگیں، پریشاں مُو
جہانگیری، جہاں بانی فقط طرّارۂ آہو
محبت شعلۂ پرّاں، ہوس بوئے گلِ بے بو
ز رازِ دہر کمتر گو
سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیّار کے غارتگروں کے نقشِ پا باقی
سبا باقی، نہ مہروئے سبا باقی

سلیماں سر بہ زانو،
اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے
کہاں سے کس سبو سے کاسۂ پیری میں مے آئے؟

مری موجِ جاں

مری موجِ جاں
موجِ کم مایہ جاں
رات بھر زیرِ دیوار، دیوار کے پاؤں میں
رینگتی سانپ لہریں بناتی رہی تھی
مگر صبح ہونے سے پہلے
انھوں نے جو دروازہ کھولا
تو میں مُردہ پایا گیا
(مرے خواب زندہ بچے تھے)
مجھے آنسوؤں کے کرم سے ہمیشہ عداوت رہی ہے
تو میں نے یہ پوچھا
عزیزو! تمھیں اس کا خدشہ نہیں ہے
کہ میرے زیاں سے، وہ آہنگِ حرف و معانی
نمودار ہوگا، مری موجِ جاں جس کی خاطر
سدا رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی ہے؟
تمھیں اس کا خدشہ نہیں ہے
کہ یہ خواب بھی
جو مری موت پر تہ نشیں رہ گئے ہیں
جنھیں تم ہزاروں برس تک
چھپاتے پھروگے اساطیر کے روزنوں میں
محبت کے کافور کو چیر کر

عقیدت کی روئی کے تودوں سے تاگہ نکل کر
عجائب گھروں میں ہزاروں برس بعد کے
زائروں کے لیے راحتِ جاں بنیں گے
تمھیں اس کا خدشہ نہیں ہے ......؟

ہنسے جیسے یہ بات میں نے
انھی کے دلوں سے چُرا لی
وہ کہنے لگے ' ہاں یہ خدشہ تو ہے '
آؤ ، اس مرنے والے کو پھر سے جلا دیں
(مگر اس کے خوابوں کو نابود کر دیں)
اسے رینگنے دیں
اسے سالہاسال پھر رینگنے دیں
کہ اس کی نگاہوں میں پھر خواب پیدا نہ ہوں
اسے رینگنے دیں
اسے سالہاسال پھر رینگنے دیں
اور آئندہ نسلوں کی جانیں
غمِ آگہی سے بچا لیں

مجھے وداع کر

مجھے وداع کر
اے میری ذات، پھر مجھے وداع کر
وہ لوگ کیا کہیں گے، میری ذات
لوگ، جو ہزار سال سے
مرے کلام کو ترس گئے

مجھے وداع کر
میں تیرے ساتھ اپنے آپ کے سیاہ غار میں
بہت پناہ لے چکا
میں اپنے ہاتھ پاؤں اپنے دل کی آگ میں
تپا چکا

مجھے وداع کر
کہ آب و گِل کے آنسوؤں کے آئنوں
کی بے صدائی سُن سکوں
حیات و مرگ کا سلام روستائی سُن سکوں
میں روز و شب کے دست و پا کی نارسائی سُن سکوں

مجھے وداع کر
بہت ہی دیر ـــــ دیر جیسی دیر ہو گئی

کہ اب گھڑی میں بیسویں صدی کی رات بج چکی
شجر حجر، وہ جانور
وہ طائرانِ خستہ پر
ہزار سال سے جو ہال میں، زمین پر
سکالے میں جمع ہیں
وہ کیا کہیں گے، میں خداؤں کی طرح
ازل کے بے وفاؤں کی طرح
پھر اپنے عہدِ منصبی سے پھر گیا؟

مجھے وداع کر، اے میری ذات
تو اپنے روزنوں کے پاس آ کے دیکھ لے
کہ ذہنِ ناتمام کی مساحتوں میں پھر
ہراس کی خزاں کے برگِ خشک یوں بکھر گئے
کہ جیسے شہرِ ہست میں
یہ نیستی کی گرد کی پکار ہوں
لہو کی دلدلوں میں حادثوں کے زہر یہ اتر گئے
تو اپنے روزنوں کے پاس آ کے دیکھ لے
کہ مشرقی افق پہ عارفوں کے خوابِ — خوابِ قہوہ رنگ میں
امید کا گزر نہیں
کہ مغربی افق پہ، مرگِ نور پر کسی کی آنکھ تر نہیں

مجھے وداع کر، مگر نہ اپنے زینوں سے اتر
کہ زینے جل رہے ہیں بے ہشی کی آگ میں
مجھے وداع کر، مگر نہ سانس لے
کہ شاعرانِ نوتری صدا کے سہم سے دبک نہ جائیں

کہ تو سدا رسالتوں کا بار ان پہ ڈالتی رہی
یہ بار ان کا حمل ہے
وہ دیکھ وحشتی کی دوسری طرف
خیال، کاغذوں کی بالیاں پہنے ہوئے
حروف بھاگتے ہوئے
تمام اپنے آپ ہی کو چاٹتے ہوئے
جہاں زمانہ تیز تیز گام تھا
وہیں زمانہ باز اپنے کھیل میں مگن
جہاں پہ بام و در لپک رہے ہیں بارشوں کی سمت
آرزو کی تشنگی لیے
وہیں گماں کے فاصلے ہیں راہزن

مجھے وداع کر
کہ شہر کی فصیل کے تمام در ہیں وا ابھی
کہیں وہ لوگ سو نہ جائیں بوریوں میں ریت کی طرح
مجھے اے میری ذات اپنے آپ سے
نکل کے جانے دے
کہ اس زباں بریدہ کی پکار، اس کی ہاؤ ہو
گلی گلی سنائی دے
کہ شہر نو کے لوگ جانتے ہیں (کاسۂ گرسنگی لیے)
کہ اُن کے آب و ناں کی جھلک ہوں میں
میں اُن کے تشنہ باغچوں میں
اپنے وقت کے دُھلائے ہاتھ سے
نئے درخت اُگاؤں گا
میں اُن کے سیم و زر سے، ان کے جسم و جاں سے

کو تار کی تہیں ہٹاؤں گا
تمام سنگ پارہ ہائے برف
اُن کے آستاں سے میں اٹھاؤں گا
کہ اُن کے شہرِ نو کے راستے تمام بند ہیں
مجھے وداع کر کر آپ اپنے میں، میں اتنے خواب جی چکا
کہ حوصلہ نہیں
میں اتنی بار اپنے زخم آپ سی چکا
کہ حوصلہ نہیں

فیض احمد فیض

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اُکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے
غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسّس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک اُلجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاک گریباں کی تلاش

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں
لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے میں
اپنا سب نور رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے

اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے
الم نصیبوں، جگر فگاروں کی
صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انھیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمھاری عزت کا
وہ جس سے تمھارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں
جو آنکھ اٹھے وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھائے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب، خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

ایک منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ
حلقۂ بام تلے سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل،
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک، رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ۔"

میراجی

رس کی انوکھی لہریں

میں یہ چاہتی ہوں کہ دنیا کی آنکھیں مجھے دیکھتی جائیں یوں دیکھتی جائیں
جیسے کوئی پیڑ کی نرم ٹہنی کو دیکھے
(لچکتی ہوئی نرم ٹہنی کو دیکھے)
مگر بوجھ پتوں کا اترے ہوئے پیرہن کی طرح سیج کے ساتھ ہی فرش پر
ایک مسلا ہوا ڈھیر بن کر پڑا ہو
میں یہ چاہتی ہوں کہ جھونکے ہوا کے لپٹتے چلے جائیں مجھ سے،
مچلتے ہوئے، چھیڑ کرتے ہوئے، ہنستے ہنستے کوئی بات کہتے ہوئے،
لاج کے بوجھ سے رکتے رکتے، سنبھلتے ہوئے، رس کی رنگین سرگوشیوں میں
میں یہ چاہتی ہوں کبھی چلتے چلتے، کبھی دوڑتے دوڑتے بڑھتی جاؤں
ہوا جیسے ندی کی لہروں سے چھوتے ہوئے، سرسراتے ہوئے بہتی جاتی ہے
رکتی نہیں ہے
اگر کوئی پنچھی سہانی صدا میں کہیں گیت گائے
تو آواز کی گرم لہریں مرے جسم سے آ کے ٹکرائیں اور لوٹ جائیں، ٹھہرنے
نہ پائیں
کبھی گرم کرنیں، کبھی نرم جھونکے،
کبھی میٹھی میٹھی فسوں ساز باتیں،
کبھی کچھ، کبھی کچھ نئے سے نیا رنگ ابھرے
ابھرتے ہی تحلیل ہو جائے پھیلی فضا میں
کوئی چیز میرے مسرت کے گھیرے میں رکنے نہ پائے،

مسرت کا گھیرا سمٹتا چلا جا رہا ہے
کھلا کھیت گندم کا پھیلا پڑا ہے
بہت دور آکاش کا شامیانہ، انوکھی سنہری بناوٹ رسیلے اشاروں سے
جھکا رہا ہے
تھپیڑوں سے پانی کی آہٹ پنچھی کے گیتوں میں گھل کر پھسلتے ہوئے،
اب نگاہوں سے اوجھل ہوئی جا رہی ہے

میں بیٹھی ہوئی ہوں
دوپٹہ مرے سر سے ڈھلکا ہوا ہے
مجھے دھیان آتا نہیں ہے، مرے گیسوؤں کو کوئی دیکھ لے گا
مسرت کا گھیرا سمٹتا چلا جا رہا ہے،
بس اب اور کوئی نئی چیز میرے مسرت کے گھیرے میں آنے نہ پائے

اونچا مکان

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
اے تمدن کے نقیب !
تیری صورت ہے مہیب،
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا،
دُھن کے ہر بل میں نئے گیت سنائی مجھے دیتے ہیں، مگر
اُن میں اک جوش ہے بیداد کا، فریاد کا اک عکسِ دراز،
اور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے،
کیا کوئی روحِ حزیں
تیرے سینے میں بھی بےتاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں ؟!

گھٹ کے لہریں ترے گیتوں کی مٹیں، مجھ کو نظر آنے لگا
ایک تلخابہ کسی بادۂ بدرنگ کا اک ٹوٹے ہوئے ساغر میں
نشّے سے نظر دھندلی ہوئی جاتی ہے
رات کی تیرہ فضا کیوں مجھے گھبراتی ہے ؟
رات کی تیرہ فضا میں تری آنکھوں کی چمک مجھ کو ڈرا سکتی نہیں ہے، میں تو
اس سے بھی بڑھ کے اندھیرے میں رہا کرتا تھا،
اور اس تیرگیٔ روح میں رخشاں تھے ستارے دُکھ کے،
اور کبھی بھول میں ہر نجمِ درخشاں سے لپک اُٹھتے تھے شعلے سُکھ کے
جیسے روزن سے ترے آگ لپکتی ہوئی پھیلاتی ہے بازو اپنے،
جذب کر لیتی ہے پھر اس کو خلا کا دامن

یاد آنے لگے تنہائی میں بہتے ہوئے آنسو اپنے
وہی آنسو، وہی شعلے سُکھ کے
لیکن اک خواب تھا، اک خواب کی مانند لپک شعلوں کی تھی،
میری تخئیل کے پر طائرِ زخمی کے پروں کی مانند
پھڑپھڑاتے ہوئے بیکار لرز اُٹھتے تھے،
میرے اعضا کا تناؤ،
مجھے جینے ہی نہ دیتا تھا، تڑپ کر اک بار،
جستجو مجھ کو رہائی کی ہوا کرتی تھی،
مگر — افسوس کہ جب درد دوا بننے لگا، مجھ سے وہ پابندی ہٹی
اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لیے
بھول کر تیری روح کو میں آ پہنچا
اس بلندی کے قدم میں نے لیے
جس پہ تو سیکڑوں دل آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے،

تیرے بارے میں سنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایات عجیب،
میں یہ سنتا تھا ترے جسمِ گرانبار میں بستر ہے بچھا،
اور اک نازنیں لیٹی ہے وہاں تنہائی،
ایک پھیکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے
ذہن میں اُس کے، مگر وہ بے تاب
منتظر اس کی ہے پردہ لرزے
پیراہن ایک ڈھلکتا ہوا، دل بن جائے
اور در آئے اک ان دیکھی، انوکھی صورت،
کچھ غرض اُس کو نہیں ہے اِس سے
دل کو بھاتی ہے، نہیں بھاتی ہے،

آنے والے کی ادا ــــــ
اُس کا ہے ایک ہی مقصود وہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے
تندرو بن جائے ترا بحر مقابل پل میں
ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ، بے لاگ، ارادے کے بغیر
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے روپ تماشائی کو
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزشِ چشمِ درست
ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کرے،
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
ایک گرتی ہوئی دیوار کی مانند لچک کھا جائے۔
یہ حکایات مرے ذہن میں اک بوئے خراماں بن کر
جب کبھی چاہتی تھیں رقص کیا کرتی تھیں،
اور اب دیکھتا ہوں سیکڑوں آنکھیں تیری
ایک ہی چشمِ درخشاں مجھے آتی ہے نظر،
کیا اسی چشمِ درخشاں میں ہے شعلہ سُکھ کا؟
ہاتھ سے اپنے اب اس آنکھ کو میں بند کیا چاہتا ہوں

کلرک کا نغمۂ محبت

سب رات مری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں
پھر صبح کی دیوی آتی ہے،
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں، منھ دھوتا ہوں،
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اس میں سے آدھی کھائی تھی
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے۔

دنیا کے رنگ انوکھے ہیں
جو میرے سامنے رہتا ہے اس کے گھر میں گھر والی ہے،
اور دائیں پہلو میں اک منزل کا ہے مکاں، وہ خالی ہے
اور بائیں جانب اک عیاش ہے جس کے یہاں اک داشتہ ہے
اور ان سب میں اک میں بھی ہوں لیکن بس تو ہی نہیں
ہیں اور تو سب آرام مجھے، اک گیسوؤں کی خوشبو ہی نہیں

فارغ ہوتا ہوں ناشتے سے اور اپنے گھر سے نکلتا ہوں
دفتر کی راہ پہ چلتا ہوں،
رستے میں شہر کی رونق ہے، اک تانگہ ہے، دو کاریں ہیں
بچے مکتب کو جاتے ہیں، اور تانگوں کی کیا بات کہوں
کاریں تو چھلتی بجلی ہیں، تانگوں کے تیروں کو کیسے سہوں
یہ مانا ان میں شریفوں کے گھر کی دھن دولت ہے، مایا ہے،

کچھ شوخ بھی ہیں، معصوم بھی ہیں،
لیکن رستے پر پیدل مجھ سے بدقسمت مغموم بھی ہیں
تانگوں پر برقِ تبسم ہے،
باتوں کا میٹھا ترنم ہے،
اکساتا ہے دھیان یہ رہ رہ کر: قدرت کے دل میں ترحم ہے؟
ہر چیز تو ہے موجود یہاں اک تو ہی نہیں، اک تو ہی نہیں
اور میری آنکھوں میں رونے کی ہمت ہی نہیں، آنسو ہی نہیں

جوں توں رستہ کٹ جاتا ہے اور بندی خانہ آتا ہے
چل کام میں اپنے دل کو لگا یوں کوئی مجھے سمجھاتا ہے
میں دھیرے دھیرے دفتر میں اپنے دل کو لے جاتا ہوں
نادان ہے دل، مورکھ بچہ — اک اور طرح دے جاتا ہوں
پھر کام کا دریا بہتا ہے اور ہوش مجھے کب رہتا ہے

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بے کار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے: میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے

جاتری

ایک آیا، گیا۔ دوسرا آئے گا، دیر سے دیکھتا ہوں یونہی رات اس کی
گزر جائے گی۔ میں کھڑا ہوں یہاں کب سے، مجھ کو کیا کام ہے، یاد آتا نہیں،
یاد بھی ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی، جس کی بتی بدلی ادھ جھپکتی ہوئی بے کراں
بے صدا قہقہہ ہے، مگر میرے کانوں نے جیسے اسے سن لیا ہے۔ جیسے آندھی چلی،
چل کے مٹ بھی گئی، آج تک میرے کانوں میں موجود ہے سائیں سائیں مچلتی ہوئی
اور ابلتی ہوئی، پھیلتی پھیلتی — دیر سے میں کھڑا ہوں یہاں۔ ایک آیا، گیا،
دوسرا آئے گا، رات اس کی گزر جائے گی۔ ایک ہنگامہ برپا ہے دیکھیں جدھر،
آرہے ہیں کئی لوگ چلتے ہوئے، اور جلتے ہوئے، اور رکتے ہوئے، پھرتے
بڑھتے ہوئے اور لپکتے ہوئے، آرہے جارہے ہیں ادھر سے ادھر، اور ادھر
سے ادھر۔ جیسے دل میں مرے دھیان کی لہر سے ایک طوفان ہے، ویسے آنکھیں
مری دیکھتی ہی چلی جا رہی ہیں کہ اک ٹمٹماتے دیے کی طرح زندگی کو پھسلتے
ہوئے اور گرتے ہوئے ڈھب سے ظاہر کیے جا رہی ہے۔ مجھے دھیان آتا ہے
اب تیرگی اک اجالا بنی ہے مگر اس اجالے سے رستی چلی جا رہی ہیں وہ امرت
کی بوندیں، جنھیں میں ہتھیلی پہ اپنی سنبھالے رہا ہوں، ہتھیلی مگر
ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی تھی، لپک سے اجالا ہوا، لو گری،
پھر اندھیرا سا چھانے لگا، بیٹھتے بیٹھتے، بیٹھ کر ایک ہی پل میں
اٹھتا ہوا، جیسے آندھی کے تیکھے تھپیڑوں سے دروازے کے طاق کھلتے
رہیں، بند ہوتے رہیں — پھڑپھڑاتے ہوئے طائرِ زخم خوردہ
کی مانند میں دیکھتا ہی رہا، ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا۔ سوچ آئی مجھے،
پاؤں بڑھنے سے انکار کرتے گئے، میں کھڑا ہی رہا، دل میں اک بوند

نے یہ کہا، رات یونہی گزر جائے گی، دل کی اک بوند کو آنکھ میں لے کے
میں دیکھتا ہی رہا، پھڑپھڑاتے ہوئے طائرِ نیم خوردہ کی مانند دروازے کے
طاق اک بار جب مل گئے، مجھ کو آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا۔ اب یہ زخمی
پرندہ نہ تڑپے گا لیکن مرے دل کو ہر وقت تڑپائے گا، میں ہتھیلی پہ
اپنی سنبھالے رہوں گا وہ امرت کی بوندیں جنھیں آنکھ سے میری رسنا تھا، لیکن
مری زندگی ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی، جس کی رکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی
ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے کہ اس تیرگی میں کوئی بات ایسی نہیں، جس کو
پہلے اندھیرے میں دیکھا ہو میں نے، سفر یہ اُجالے اندھیرے کا چلتا رہا ہے
تو چلتا رہے گا، یہی رسم ہے راہ کی، ایک آیا گیا، دوسرا آئے گا، رات
ایسے گزر جائے گی، ٹمٹماتے ستارے بتاتے تھے، رستے کی ندی بہی جا رہی ہے،
بہے جا، اس الجھن سے ایسے نکل جا، کوئی سیدھا منزل پہ جاتا تھا
لیکن کئی قافلے بھول جاتے تھے انجم کے دورِ یگانہ کے مبہم اشارے، مگر وہ
بھی چلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے شام سے پہلے ہی دیکھ لیتے تھے مقصود کا بند دروازہ
کھلنے لگا ہے، مگر میں کھڑا ہوں یہاں، مجھ کو کیا کام ہے، میرا دروازہ کھلتا نہیں
ہے، مجھے پھیلے صحرا کی سوئی ہوئی ریت کا ذرّہ ذرّہ یہی کہہ رہا ہے کہ ایسے خرابے میں
سوکھی ہتھیلی ہے اک ایسا توا کہ جس کو کسی خار کی نوک چبھنے پہ بھی کہہ نہیں سکتی
مجھ کو کوئی بوند اپنے لہو کی پلا دو، مگر میں کھڑا ہوں یہاں کس لیے؟ کام کوئی
نہیں ہے تو میں بھی ان آتے ہوئے اور جاتے ہوئے ایک، دو، تین — لاکھوں
بگولوں میں مل کر یونہی چلتے چلتے کہیں ڈوب جاتا کہ جیسے یہاں بہتی لہروں میں
کشتی ہر اک موج کو تھام لیتی ہے اپنی ہتھیلی کے پھیلے کنول میں، مجھے دھیان
آتا نہیں ہے کہ اس راہ میں تو ہر اک جانے والے کے بس میں ہے منزل، میں چل دوں،
چلوں، آئیے آئیے، آپ کیوں اس جگہ ایسے چپ چاپ تنہا کھڑے ہیں،
اگر آپ کہیے تو ہم اک اچھوتی سی ٹہنی سے دو پھول — بس بس، مجھے
اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں اک دوست کا راستہ دیکھتا ہوں، — مگر
وہ چلا بھی گیا ہے، مجھے پھر بھی تسکین آتی نہیں ہے کہ میں ایک صحرا کا باشندہ

معلوم ہونے لگا ہوں خود اپنی نظر میں۔ مجھے اب کوئی بند دروازہ کھلتا نظر آئے،
یہ بات ممکن نہیں ہے، میں اک اور آندھی کا مشتاق ہوں جو مجھے اپنے
پردے میں یکسر چھپا لے، مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا ہے سہانا سماں جتنا
بس میں تھا میرے وہ سب ایک جھٹا سا جھونکا بنا ہے جسے ہاتھ میرے نہیں
روک نہیں سکتے کہ میری ہتھیلی میں امرت کی بوندیں تو باقی نہیں ہیں، فقط
ایک پھیلا ہوا، خشک، بے برگ، بے رنگ صحرا ہے جس میں یہ ممکن نہیں میں کبھی
سے ایک آیا گیا، دوسرا آئے گا، ت میری گزر جائے گی۔

مجھے گھر یاد آتا ہے

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو
یہ پھیلا آسماں اس وقت کیوں دل کو لبھاتا تھا
ہر اک سمت اب انوکھے لوگ ہیں اور ان کی باتیں ہیں
کوئی دل سے پھسل جاتی، کوئی سینے میں چبھ جاتی
انہی باتوں کی لہروں پر بہا جاتا ہے یہ بجرا
جسے ساحل نہیں ملتا

میں جس کے سامنے آؤں مجھے لازم ہے لیکن مسکراہٹ میں کہیں یہ ہونٹ
"تم کو جانتا ہوں" دل کہے "کب جانتا ہوں میں"
انہی لہروں پہ بہتا ہوں، مجھے ساحل نہیں ملتا

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو
وہ کیسی مسکراہٹ تھی، بہن کی مسکراہٹ تھی" مرا بھائی بھی ہنستا تھا
وہ ہنستا تھا، بہن ہنستی ہے، اپنے دل میں کہتی ہے
یہ کیسی بات بھائی نے کہی، دیکھو وہ اماں اور ابا کو ہنسی آئی
مگر یوں وقت بہتا ہے، تماشا بن گیا ساحل
مجھے ساحل نہیں ملتا

سمٹ کر کس لیے نقطہ نہیں بنتی زمیں؟ کہہ دو
یہ کیسا پھیر ہے، تقدیر کا یہ پھیر تو شاید نہیں، لیکن

یہ پھیلا آسماں اُس وقت کیوں دل کو لبھاتا تھا؟

حیاتِ مختصر سب کی بہی جاتی ہے اور میں بھی
ہر اک کو دیکھتا ہوں مسکراتا ہے کہ ہنستا ہے
کوئی ہنستا نظر آئے، کوئی روتا نظر آئے
میں سب کو دیکھتا ہوں، دیکھ کر خاموش رہتا ہوں
مجھے ساحل نہیں ملتا۔

سمندر کا بُلاوا

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو
بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں، مگر یہ انوکھی صدا آ رہی ہے"
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا
"مرے پیارے بچے" "مجھے تم سے کتنی محبت ہے" "دیکھو اگر یوں کیا تو برا مجھ سے
بڑھ کر بھی کوئی نہ ہوگا" — "خدایا خدایا"۔
کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری،
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیاتِ دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی صدا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے

اب آنکھوں میں جنبش، نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری،
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں
یہ اک گلستاں ہے، ہوا لہلہاتی ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، غنچے مہکتے ہیں
اور پھول کھلتے ہیں، کھل کھل کے مرجھا کے گرتے ہیں، اک فرشِ مخمل
بناتے ہیں جس پہ مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستاں بھی اک آئینہ ہے
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری، سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ ابھری

یہ پربت ہے خاموش ساکن
کبھی کوئی چشمہ اُبلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اُس پار کیا ہے
مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے ——— دامن میں وادی ہے
وادی میں ندی ہے، ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے،
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری، مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو وہ
پھر نہ ابھری

یہ صحرا ہے ——— پھیلا ہوا خشک، بے برگ صحرا
بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکس مجسم بنے ہیں
مگر میں تو دور ——— ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

نہ اب کوئی صحرا، نہ پربت نہ کوئی گلستاں
اب آنکھوں میں جنبش، نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری
فقط اک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے، نہ شاید تھکے گا
تو پھر یہ صدا آئینہ ہے ——— فقط میں تھکا ہوں کسی کو بلاتے بلاتے

مخدوم محی الدین

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں،
باڑھ کے تار،
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی، کبھی ماؤں کی

چاند کے، تبسم کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

چاند تاروں کا بن

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مردوزن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

کچھ ادیبان صد کرّوفن
اُن کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
اُن کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا، اُجالا بھی ہے

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

لختِ جگر

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنوئیں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی

وہ آواز
ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کی ہادی بنی
پھر خدا بن گئی

کوئی ماں
کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سرِ رہگذر
اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی

وہ ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوع انساں کا ہادی بنا
پھر خدا بن گیا۔

وصال

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی
جھومر چمکا
سناٹے چونکے
آدھی رات کی آنکھ کھلی
برہ کی آنچ کی نیلی لو
نَے بنتی ہے
نَے بنتی ہے

شہنائی جلتی روتی تھی
اب سر نیوڑھائے
لال پپوٹے بند کیے بیٹھی ہے
نرم گرم ہاتھوں کی مہندی
ایک نیا سنگیت سناتی
دل کے کواڑ پہ رک رک کر کوئی راتوں میں دستک دیتا تھا
دل کے کواڑ پہ رک رک کر وہ دستک دیتا ہے
پٹ کھلتے ہیں
آنکھ سے آنکھ دلوں سے دل ملتے ہیں
گھونگھٹ میں جھومر چھپتا ہے
گھونگھٹ میں مکھڑے چھپتے ہیں

دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں
بڈھا ناگ کھڑا روتا ہے
گونگے سناٹے بول اٹھے
گھونگھٹ، مکھڑے، جھومر، پائل
چمک، دمک، جھنکار امر ہے
پیار امر ہے
پیارا امر ہے
پیار کی رات کی سگندھ اُمڈ آتی ہے
اور وہ پھول
تنو ر بدن
شبنم پی کر سو جاتے ہیں

سردار جعفری

پتھر کی دیوار

کیسا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی
آدمی بھی محنت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
اک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے
ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزرتے ہیں

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں

نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریکیں
بعند شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں
پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں
پتھروں کی دیواریں
بارکوں کی تعمیریں

اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں
بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدّے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں
درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی زنجیریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی

نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں
جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہرے پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بےحسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں
پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں ، تمنائیں
آرزوئیں ، امیدیں
خواب اور تعبیریں
اشک ، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں
اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے سے
سرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں

گھنٹیاں سی بجتی ہیں
جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک، آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقش پا بغاوت کے

جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
زہر اور چڑھتا ہے

ظالموں کی شدت پر
ظلم ہیچ اٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
"انقلاب زندہ باد"
خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتیوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کے کوڑوں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظام زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عام جمہوری

اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بے بسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے

اودھ کی خاکِ حسیں

گزرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اُڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصور کے زخم خوردہ
اُفق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں

میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈھتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دلنواز باہیں
وہ شاخ صندل
کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لیے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں

ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لُبھا رہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں بگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیجِ بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سُرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

مرے تصور میں ساقیوں کا خرامِ رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں
نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے نیچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں

[redacted]

وہ گاؤں جو سینکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا، یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولھوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر لٹکے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو ادھر کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
وہ کھیتوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نور بن کر اتر رہے ہیں۔
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اُگے ہوئے ہیں
کُدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں
زمین کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک جدا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
بلکتی آنتوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمیں کے سینے پہ قاتلوں کے گروہ کب تک چلا کریں گے
خباثتیں کب تلک اہنسا کا روپ دھارے پھرا کریں گی
کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جھکے ہیں
وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں
جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں
یہ جسم جو کارخانے داروں کی بھٹیوں میں اُبل رہے ہیں
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں

یہ خون جو نفع خوربنیوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں
جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اُگا رہے ہیں
یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے
یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
یہ زخم کب تک ہرے رہیں گے

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سُرخ شعلے اُبل رہے ہیں
غموں کی بھاری سلیں دلوں سے سرک رہی ہیں
شجاعتیں گو پھنوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جُھکے ہوئے سر اُبھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے
یہ آسمانِ خموش طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے
یہ مسکراتی ہوئی فضا سُرخ آندھیوں سے بھری ہوئی ہے
یہاں کا ایک ایک چپّہ لاکھوں بغاوتوں سے بسا ہوا ہے
بغاوتیں جو مغل شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں
بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں
بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پہ ہیبت بٹھا چکی ہیں
یہی پرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو

میں ان پرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجماں ہوں
میں اپنے اہلِ وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپا لے
لٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں
میں لاکھوں مزدور نوجوانوں کے ساتھ میداں میں آ رہا ہوں
غدر کے مقتول سورماؤں کو مرقدوں سے اٹھا رہا ہوں
میں چوری چورا کے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں
چمن کے پھولو! چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخو! فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو! ہوا میں جوالا مکھی اچھالو
ملوں کے پہیو! بغاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہو اے نیکیوں کی فوجو!
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتو! آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز و تند موجو! قضا کے خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنو! اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو

اودھر کی خاکِ حسیں کے ذرّو
جو سیکڑوں میل دور سے اڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
مرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا
اسے بتانا
کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آ گیا ہے
جسے اہنسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے

مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کوئی دبا سکا ہے ؟
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

میرا سفر

"ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم"
(رومی)

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک مشتِ غبارِ انساں پر

شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل،
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے

ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

نوالا

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
بچّہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا
کارخانوں کے کام آئے گا
اپنے مجبور پیٹ کی خاطر
بھوک سرمائے کی بڑھائے گا
ہاتھ سونے کے پھول اُگلیں گے
جسم چاندی کا دھن لٹائے گا
کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن
خون اس کا دیے جلائے گا
یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے
خونیں سرمائے کا نوالا ہے
پوچھتی ہے یہ اس کی خاموشی
کوئی مجھ کو بچانے والا ہے

جاں نثار اختر

آخری ملاقات

مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

دو پاؤں بنے ہریالی پر
اک تتلی بیٹھی ڈالی پر
کچھ جگمگ جگنو جنگل سے
کچھ جھومتے ہاتھی بادل سے
یہ ایک کہانی نیند بھری
اک تخت پہ بیٹھی ایک پری
کچھ گن گن کرتے پروانے
دو ننھے ننھے دستانے
کچھ اڑتے رنگیں غبارے
ببو کے دوپٹے کے تارے
یہ چہرہ بنو بوڑھی کا
یہ ٹکڑا ماں کی چوڑی کا
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

الساٸی ہوٸی رُت ساون کی
کچھ سوندھی خوشبو آنگن کی
اک ٹوٹی رسّی جھولے کی
اک چوٹ کسکتی کوہلے کی
سلگی سی انگیٹھی جاڑوں میں
اک چہرہ کتنی آڑوں میں
کچھ چاندنی راتیں گرمی کی
اک لب پر باتیں نرمی کی
کچھ روپ حسین کاشانوں کا
کچھ رنگ ہرے میدانوں کا
کچھ ہار مہکتی کلیوں کے
کچھ نام وطن کی گلیوں کے
مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

کچھ چاند چمکتے گالوں کے
کچھ بھونرے کالے بالوں کے
کچھ نازک شکنیں آنچل کی
کچھ نرم لکیریں کاجل کی
اک کھوئی کڑی افسانوں کی
دو آنکھیں روشن دانوں کی
اک سرخ دلائی گوٹ لگی
کیا جانے کب کی چوٹ لگی

اک چھلا پھیکی رنگت کا
اک لاکٹ دل کی صورت کا
رومال کئی ریشم سے کڑھے
وہ خط جو کبھی میں نے نہ پڑھے
مت روکو انہیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنہیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

کچھ اجڑی مانگیں شاموں کی
آواز شکستہ جاموں کی
کچھ ٹکڑے خالی بوتل کے
کچھ گھنگھرو ٹوٹی پائل کے
کچھ بکھرے تنکے چلمن کے
کچھ پرزے اپنے دامن کے
یہ تارے کچھ تھرّائے ہوئے
یہ گیت کبھی کے گائے ہوئے
کچھ شعر پرانی غزلوں کے
عنوان ادھوری نظموں کے
ٹوٹی ہوئی اک اشکوں کی لڑی
اک خشک قلم، اک بند گھڑی
مت روکو انہیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنہیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

کچھ رشتے ٹوٹے ٹوٹے سے
کچھ ساتھی چھوٹے چھوٹے سے
کچھ بگڑی بگڑی تصویریں
کچھ دھندلی دھندلی تحریریں
کچھ آنسو چھلکے چھلکے سے
کچھ موتی ڈھلکے ڈھلکے سے
کچھ نقش یہ حیراں حیراں سے
کچھ عکس یہ لرزاں لرزاں سے
کچھ اجڑی اجڑی دنیائیں
کچھ بھٹکی بھٹکی آشائیں
کچھ بکھرے بکھرے سپنے ہیں
یہ غیر نہیں سب اپنے ہیں
مت روکو انھیں پاس آنے دو
یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں
میں خود نہ جنھیں پہچان سکوں
کچھ اتنے دھندلے سائے ہیں

علی جواد زیدی

ہولی

پہلے نماز اور تھی، مے اور تھی، زنار اور تھا
نہ بولیاں ہی اور تھیں، نہ ٹولیاں ہی اور تھیں، نہ جھولیاں ہی اور تھیں
لیکن مرے میرِ خوباں !
کل تو نیا انداز تھا
اک دور کا تھا خاتمہ، اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بنا کر ٹولیاں
ہنستے ہنستے گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے
مسجد سے منہ موڑے ہوئے
مندر کا سنگِ آستاں چھوڑے ہوئے
گرجا سے کترائے ہوئے
جیسے کہ ہوں روحانیت کی زندگانی ہی سے گھبرائے ہوئے
غدرِ وفاداری کا یہ انجام تھا
مگر گنہگاری کا تازہ، دلربا پیغام تھا
تیرے ہی کوچے میں یہ سب عہدِ وفا توڑے گئے
رشتے نئے جوڑے گئے
اور پھر گنہگاروں نے کیا رندانہ ہنگامے کیے
اس وقت ان کو یاد تھا بس ایک ترسانا ترا
مفلس وفاداروں کو للچانا ترا

جب میکدے کی گود میں
تیری جفا، تیری سزا کے نام پر ساغر چلے
سوکھے ہوئے کاسے لبالب بھر چلے
سب اپنے لب تر کر چلے
پھر توڑدیں وہ پیالیاں جن میں سدا پی آئے تھے
شیشے چھنا چھن، چھن چھنا چھن ٹوٹتے
اور رند لذت لوٹتے
ٹوٹے ہوئے شیشوں کا اک انبار تھا
شیشوں کے اس انبار میں اک وہ بھی کہنہ جام تھا
جس کو سکندر کے قوی ہیکل جواں
بھاگے تھے پورس کی زمیں کو چھوڑ کر
ان میں وہ کاسے بھی تو ہیں جن کو عرب لے آئے تھے
اپنی عبا سے ڈھانپ کر
پینے سے پہلے دیکھتے تھے محتسب کو جھانک کر
لیکن کبھی
پینے سے باز آتے نہ تھے، فاتح جو تھے
ان میں ہیں ایسے جام بھی
جن پر پٹھانوں کے قوی ہاتھوں کے دھندلے سے نشاں
کچھ آج بھی موجود ہیں
اور ان نشانوں میں ہے خوں مفتوح ہندوستان کا
اور ان میں ہیں وہ جام بھی جن کو مغل لے آئے تھے
تاتار سے، قندھار سے، کابل سے، ترکستان سے
مفتوح ہندوستان میں
جن کو وہ اپنے قصر عالیشان میں چھلکاتے رہے
تیغوں سے کھنکاتے رہے

اور وہ حسین، نازک، سبک، ہلکی صراحی کس کی ہے
پیرس کے میخانوں میں یہ مشہور تھی
لایا تھا اک تاجر اسے جو بعد میں فاتح بنا
یہ ہلکے شیشوں کے گلاس اور یہ نئے ہلکے سے کپ
جن پر لکھا ہے "یہ بنے تھے ملک انگلستان میں"
اور حال کی صدیاں ہیں یہ چلتے رہے
پینے کو مل جاتی تھی جب پیتے رہے ہم
لیکن تہی دستی کا یہ عالم تھا دل جلتے رہے
ہم آج گھبرا ہی گئے
اور ان سبھی شیشوں کو ٹھلتا چور کر ڈالا دفورِ جوش میں
چھن چھن چھنا چھن توڑ کر
جیسے کہ بربادی کی دیوی چھم چھما چھم ناچتی
ہولی منانے کے لیے میخانے میں آ ہی گئی
ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اس انبار پر
ہم نے جلائی آگ یوں
زردشت کا پاکیزہ دل سچائیوں پر ہنس دیا
جیسے کہ یہ کہنے لگا
"جلنے دو، جلنے دو یونہی، شیشے پگھلنے دو یونہی"
تیرے وفاداروں نے یوں پیرِ مغاں
شب بھر جلائیں ہولیاں
نعرے وہ مستانہ لگے اس جوش میں
دل گر پڑے احساس کی آغوش میں
اور بول اٹھے "تسلیم، اے پیرِ مغاں، جاتے ہیں ہم
کل پھر پلٹ کر آئیں گے
اس وقت اس میخانے میں سامان ہوں گے دوسرے

تیرے پرانے ذہن کے معیار توڑے جائیں گے
تعمیرِ نو کی جائے گی
لیکن ہمارے سال خوردہ، مہرباں، پیرِ مغاں!
تجھ کو بُرا لگتا ہے کیوں؟
غیروں کا کیا، تیرا بھی کیا؟
یہ میکدہ ہم سب کا ہے پنچایتی
تو کیا ہے، تیرا خوف کیا؟
کہہ تو دیا، پیرِ مغاں! کل پھر پلٹ کر آئیں گے
ہرگز نہ ہم باز آئیں گے
کس کو ڈراتا ہے کہ تم اس کی سزا پاؤ گے
گاتے تھے ہم، گاتے ہیں ہم، گائیں گے ہم
ہرگز نہ باز آئیں گے ہم
جو عمر بھر پیتے تھے پیتے جائیں گے
جھیلیں گے، جیتے جائیں گے
پیروں میں ہے زنجیر لیکن ٹوٹ بھی سکتی ہے یہ
ہاں آج ہستی قید ہے، کل چھوٹ بھی سکتی ہے یہ
گانے دے گانے دے ہمیں
دھومیں مچانے دے ہمیں
شیشے کو شیشے سے لڑانے دے ہمیں
چھن چھن چھنا چھن کی صدا
بڑھنے دے، بڑھنے دے ابھی
ہم مست و بے خود، ناچتے، گاتے، جلاتے، توڑتے
ہنستے رہیں، چلتے رہیں
اور تو بھی خود پیرِ مغاں!
ہولی کے نغمے سن ذرا اور دیکھ اپنی آنکھ سے

تیرے وفاداروں نے کیا کھیلیں گلابی ہولیاں"

*

منھ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار میں
سبزے لچکتی ڈالیاں، گنجان، سندر جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں جھکتی پتیاں
یہ سب بھی، لیکن یہاں وہ شے کہاں
جس کے لیے مشہور ہے انگورِ ناب

ہاں، کیا کہا پیرِ مغاں ؟
"تلوؤں کے نیچے پھول ہیں، ان میں سے دو اک چن بھی لوں
"خالی ہیں گلدستے ترے"
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے خالی ہی رہ جائیں گے اب
پھولوں نے ٹھانی ہے کہ شاخوں ہی پہ مرجھائیں گے اب
اور تیرے کمروں میں نہ وہ آئیں گے اب
منھ بند کلیاں اب کہاں ؟
جو اپنی سندر، موہنی مسکان کر دیں رائیگاں
اور اپنا گلشن چھوڑ دیں، سینے میں خوشبوئیں لیے
اور اجنبی ماحول میں
طاقِ نظر کی کانپتی زینت بنیں
کلیوں کے منھ اب کھل چکے، منھ بند کلیاں اب کہاں
کلیاں کہاں، یہ پھول ہیں
خاکِ چمن کی گود میں آرامِ جاں یہ پھول ہیں
آتش زباں یہ پھول ہیں
اور دیکھ تو یہ پھول کتنے شوخ ہیں

جو ٹوٹ کر شاخوں سے گر جاتے ہیں تیری راہ میں
اے دلشکن پیرِ مغاں!
آ دیکھ ان کی ہمتیں
یہ چاہتے ہیں روک دیں گلزار میں راہیں تری
تیرے لیے چارہ ہی کیا اب رہ گیا
ان بے حیا پھولوں کی آنکھوں کا تو پانی بہہ گیا
اب ہیں یہ ان کی جرأتیں روکیں گے تیرے راستے
تو بھی خدا کے واسطے
ان کو کچل دے پیس دے
ورنہ خدا نا خواستہ
یہ روک ہی لیں راستہ
کلیاں نہیں کانٹے ہیں یہ
کانٹوں سے بھی بدتر ہیں یہ نشتر ہیں یہ خنجر ہیں یہ
گلزار میں تیرے قدم کچھ آج تو آئے نہیں
تو نے انھیں سبزوں پہ کی ہے مے کشی
صدیوں سے تیرا دور ہے
گلزار پر ہے حق ترا

تو ڈر گیا، پیرِ مغاں
کتنا بھیانک خواب تھا
تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے کل
کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے
کھیلیں گلابی ہولیاں۔

احمد ندیم قاسمی

عنفوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب
ایک معصوم کلی
شاخساروں سے ہمک کر نکلی
آئینہ دیکھ کے شرمائی، لجائی، اکڑی
پھر جھجکی، لے کے سنبھلنا چاہا
لیکن احساسِ جمال
ایک کوندا ہے جو لپکے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے
اور معصوم کلی
کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی
چور ہوئی
غنچہ تخلیق ہوا
آئینہ چونک اٹھا

آزادی کے بعد

کتنے خاکے مری امنگوں کے
پیچ کھاتے ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم
یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتے
کتنی جسا د حقیقتوں کے کفن

روٹیاں بوٹیوں سے تُلتی ہیں
عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے
اپنے بچپن کے رہگزاروں کو
جیسے معزول شہریار تکتے
اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی، عزمِ زندگی سے تہی
کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہدِ کہنہ سال کی مانند
مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا
زندگی! زندگی! پکارتا ہے
سسکیاں لے کے اپنے ہونٹوں سے
خون کی پیڑیاں اُتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

ایک منظر

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے
اس سیل جمال کے سہارے
ماضی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے
خوشبوئے حنا کا ایک پیکر
جلتی ہوئی انگلیوں کی لو سے
چھوتا ہے لبوں کے جب کنارے
کھل جاتے ہیں مصلحت کے اصنام
ہٹ جاتے ہیں قصرِ دل سے پہرے
آتے ہیں خیال پیارے پیارے
اک عمر کے بعد جب کھلی آنکھ
گنجان صنوبروں کے پیچھے
چاند آخرکار اتر چکا ہے
گردش تو فضا میں گونجتی ہے
لمحوں کی تو چاپ سن رہا ہوں
میرے لیے وقت مر چکا ہے

ریستوراں

ریستوراں میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے
قبروں کے کتبوں پہ جیسے مسلے مسلے سہرے

اک صاحب جو سوچ رہے ہیں پچھلے ایک پہر سے
یوں لگتے ہیں جیسے بچہ روٹھ کر آیا ہو گھر سے
کافی کی پیالی کو لبوں تک لائیں تو کیسے لائیں
بیرے تک سے آنکھ ملا کر بات نہ جو کر پائیں

کتنی سنجیدہ بیٹھی ہے یہ احباب کی ٹولی
کتنے اوج بلاغت پر ہے خاموشی کی بولی
ساری قوت چوس چکی دن بھر کی شہر نوردی
ہاتھوں میں سے جھانک رہی ہے مرتی دھوپ کی زردی

لمبی لمبی پلکیں جھپکے اک ست رنگی بی بی
بالوں کی ترتیب سے جھلکے ذہن کی بے ترتیبی
شوہر کو دیکھے تو لجائے، لاج کو اوٹ بنائے
ہر آنے والے پر اک بھرپور نظر دوڑائے

اک لڑکی اور تین جواں آئے ہیں کیسے کسائے
سانولے روپ کو گورے ملکوں کا بہروپ بنائے
باتوں میں نخوت ناغوں کی، وحشت صحراؤں کی
آنکھوں کے چولھوں میں بکھری ہے راکھ تمناؤں کی

اپنی اپنی الجھن سب کی، اپنی اپنی راسے
سینے آنسو روک رکھے ہیں، کون کسے بہلائے
ہر شے پر شک ہو تو جینا ایک سزا بن جائے
خود ہی موجود نہ ہو تو گردش کس کس کام آئے

قہقہے جیسے خالی برتن لڑھک لڑھک کر ٹوٹیں
بحثیں جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں
حسن کا ذکر کریں یوں جیسے آندھی پھول کھلائے
فن کی بات کریں یوں جیسے بنیا شعر سنائے

سکڑی سمٹی روحیں لیکن جسم ہیں دوہرے تہرے
ریتواں میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے

پابندی

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں تیری سیاست فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

یوسف ظفر

وادیٔ نیل

جمالِ مرگ آفریں! یہ شب میری زندگی ہے
نچوڑ دے اس کے چند لمحوں کی عشرتوں میں
وہ مے، وہ نشہ، کہ ساغرِ ماہ و سال میں ہے
وہ مے کہ تیرے جمال میں ہے
وصال میں ہے
وصال! تیرا وصال! وہ شعلۂ اجل ہے
کہ جس میں جل کر کئی پتنگے ابد کی منزل کو پا چکے ہیں
ابد کی منزل!
سحر کی پہلی کرن —— وہ ناگن
کہ میرے سینے سے آخری سانس بن کے پلٹے گی۔ آ مری جاں!
جمالِ مرگ آفریں! —— یہ شب میری زندگی ہے

میرے لبوں نے وہ لب بھی چوسے ہیں جن میں مرگِ گراں نہیں تھی
وہ پھول سے لب کہ جن کی تہہ دار پتیوں میں
تمازتِ بادۂ وفا تھی
مرے جواں سال بازوؤں نے
دھڑکتے مرمر کی ان چٹانوں سے رس نچوڑا ہے زندگی کا
جنھیں گماں تھا کہ میرے پہلو میں دم نکلنا ہی زندگی ہے

مرے ہی سینے پہ جاگتی ہیں ابھی وہ راتیں
کہ جن میں اُبھرے ہیں آفتابِ جمال میری مسرتوں کے
وہ آفتابِ جمال، جو کل سحر کی پہلی کرن کے ڈرنے سے
میرے ہمراہ جل بجھیں گے —

ترے تبسم کی لو اُبھرتی ہی جا رہی ہے
تجھے نظر آ رہی ہے شاید وہ زیست جو لاش بن کے تڑپے گی
کل سحر کو
مگر میں کچھ اور دیکھتا ہوں
اگر میں یہ شب گزار دیتا گرسنہ شیروں کے جنگلوں میں
جہاں ہر اک لحظہ موت منھ پھاڑ کر جھپٹتی ہے
بے بسی پر
اگر میں یہ شب گزار دیتا کسی سمندر کے سرد سینے کی دھڑکنی پر
جہاں ہر اک لحظہ موت منھ پھاڑ کر جھپٹتی ہے
بے بسی پر
اگر میں یہ شب گزار دیتا کسی غمِ مرگ آفریں میں
کہ جس کے چنگل میں لحظہ لحظہ لہو ٹپکتا ہے آرزو کا
عجب نہ تھا آج شب اگر میرا کوئی دشمن
مرے بدن سے یہ نوکِ خنجر نکال دیتا وہ خوں جو اب میری زندگی ہے
جوابِ ترے پیکرِ مسرت کی وادیوں میں
مری حقیقت کا رازداں ہے
قبول ہے مجھ کو آج کی شب — سحر ہے جس کی ابد کی منزل
جمالِ مرگ آفریں! یہ شب میری زندگی ہے

مرا مقدر، کہ آج کی شب ہے مجھ کو حاصل یہ تیرا پیکر

مرا مقدّر، کہ میں نے خود موت کو پکارا ہے تیری خاطر
مرا مقدّر، کہ میں ہوں وہ موت کا مسافر
جو اپنی منزل پہ آگیا ہے ترے شبستاں میں خود ٹھہر کر
ترے لبوں سے حیات پا کر
ترے جمالِ حیات پرور سے لو لگا کر
تری نگاہوں کی گہری جھیلوں میں تیر کر، مشعلیں جلا کر
گداز پیکر کی ریشمیں چلمنیں اٹھا کر
دھڑکتے دل میں ترانے بو کر، زمانے لا کر
ازل، ابد کو سمیٹ کر، بیکراں بنا کر
ترے بدن کی لطافتوں میں مسرتِ زندگی ملا کر
ترے لہو میں شرارے بھر کر، حرارتِ جاوداں بسا کر
ترے خمستانِ دلبری کو جہاں میں اک داستاں بنا کر
تجھے اجل سے قریب لا کر
حقیقتِ زندگی دکھا کر
کہ میں ہوں وہ موت کا مسافر
ترے شبستاں کے چور دروازے سے گزر کر
جو اپنی منزل پہ آگیا ہے

وہ لوگ جو رو رہے ہیں مجھ کو
کہ میں نے خود موت کو پکارا ہے تیری خاطر
وہ لوگ کیا جانیں زندگی کو
انھیں خبر کیا کہ موت ہر لحظہ ان کی ہستی کو کھا رہی ہے
انھیں خبر کیا کہ زندگی کیا ہے — میں سمجھتا ہوں زندگی کو
کہ آج کی شب یہ زندگی، میری زندگی ہے
یہ زندگی ہے مری، جسے میں نے آج کی شب

ترے مسرت کدے میں لاکر
ابد سے ہم دوش کر دیا ہے
اجل کو خاموش کر دیا ہے

تھرک رہا ہے ترا بدن لذتِ طرب سے
چمک رہی ہیں تری نگاہیں خمارِ شب سے
اُچک اُچک کر سحر مجھے دیکھنے لگی ہے
سحر کا تھا انتظار کب سے۔

قیوم نظر

اکیلا

میرے پیچھے جانے والے کل کا دھندلکا
ایسی شکلیں جن کے نقش ہوا پر، جیسے تحریریں ہوں
ایسے قصے جن کے دامن پر سایوں کی تصویریں ہوں

میرے سامنے آنے والے کل کا اُجالا
ایسی نسلیں جن کے الہاموں کی مبہم تفسیریں ہوں
ایسے زمانے جن میں چاند کو پالینے کی تدبیریں ہوں

جانی دھرتی سے انجانے نیلے فلک کا
میں وہ "آج" ہوں جس کے لیے دونوں ہی کل تعزیریں ہوں
جس کی ساتھی تنہائی کے آنسوؤں کی زنجیریں ہوں

راجہ مہدی علی خاں

خودکشی

رحیم اللہ ہوا اچھا تو اُس نے
یہ دیکھا ہو چکی ہے "پارٹیشن"
گئے کچھ بھاگ اور کچھ مر چکے ہیں
نہ نیتا سنگھ باقی ہے نہ بھگشن

سُنے اس داستاں کے جب فسانے
تو غصے نے بنایا اس کو مجنوں
تڑپ اٹھا کہ لے کیسے وہ بدلہ
پیے ان کافروں کا کس طرح خوں

نہ کیوں کہلا سکا وہ مردِ غازی
وہ اس غم میں کئی راتیں نہ سویا
شہادت ہی کا رُتبہ اس کو ملتا
نہ جب یہ مل سکا وہ خوب رویا

یکایک اس کے سب پلٹے خیالات
تو اُس نے دامنِ اسلام چھوڑا
کنارہ کش ہوا سب بھائیوں سے
نئے مذہب سے رشتہ اپنا جوڑا

کئی دن بعد جب نکلا وہ گھر سے
تو اُس کے منھ پہ داڑھی سر پہ تھے بال
نہالا سنگھ اب تھا نام اُس کا
لیے کرپان وہ غصے سے تھا لال

ہزاروں خونفشاں ارمان لے کے
کھڑا تھا آج وہ مسجد کے آگے
پکڑنے کے لیے اس کو نمازی
نمازیں چھوڑ کر مسجد سے بھاگے

لگا کر ایک نعرہ وحشت آلود
وہی کرپان جھٹ اُس نے نکالی
لگا کر قہقہہ پھر اک فلک رس
معاً سینے میں اپنے گھونپ ڈالی

نکالا پھر اُسے سینے سے باہر
گلے پر زور سے اس کو پھرایا
اور اپنے جاں بحق ہونے سے پہلے
بیاں اپنا یہ رُک رُک کر سنایا

تمنا تھی کہ اک سکھ میں بھی ماروں
یہ پوری تو نے کی اللہ تعالیٰ
بہت خوش ہوں رحیم اللہ خاں نے
نہالا سنگھ جی کو مار ڈالا۔

سلام مچھلی شہری

اندیشہ

آرٹسٹ! اپنی یہ تصویر مکمل کر دے
ہاں یہ ہونٹ اور بھی پتلے ہوں، یہ آنکھ اور بھی مست
لیکن ان گالوں کی سرخی کو ذرا کم کر دے
میں نے شاید انھیں مرجھایا ہوا پایا ہے
ہلکے اشکوں سے ان آنکھوں کو ذرا نم کر دے
میں نے افسردہ نگاہوں سے یہی سمجھا ہے
آج بھی میں نے سرِ راہ اسے دیکھا ہے
ایک شہکار اسے جب بنا لے اے دوست
ورنہ تصویر کا خاکہ ہی بنتا ہوگا۔

ڈرائنگ روم

یہ سینری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں
یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے
یہ ریڈیو ہے، یہ قمقمے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے
یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں

ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے یہ
ہاں اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے
ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہوجاتی ہے
سمجھی کہ نہیں یہ کمرہ ہے، ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ

اتنی جلدی مزدور عورت آخر یہ گلے میں باہیں کیوں؟
لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے
اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے
اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟

میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل میں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل کے میلے آنچل میں

جنگل کا ناچ

جنگلی لباس میں ایک پیکرِ گداز
چل رہا ہے جھاڑیوں میں سانپ جھوم جھوم کر
اُڑ رہا ہے مور اپنے بال چوم چوم کر
جھیل مانگنے لگی شام کی ہوا سے ساز
ایک بار، تین بار
دست صندلی اٹھے
پاؤں لہرکھا گئے
جسم ناز کے شرار
جھیل کے کنارے، مست ہو کے ناچنے لگے
جنگلی جوان شام کو سکون پا گئے
جھونپڑوں سے اپنے اپنے ساز لے کے آگئے
آسماں سے چاند اور ستارے جھانکنے لگے
چاندنی میں جاگ اٹھی
سو رہی تھی صبح سے
بول کیسے خواب تھے؟
میرے "بُدھ" کی مورتی
جھاڑیوں سے سُرخ زرد پھول توڑ توڑ کر
ایک بار، تین بار، اور اب تو بار بار
مورتی پہ جنگلی حسینہ کرتی ہے نثار

چشم و لب کے رقص پر ہاتھ موڑ موڑ کر
رقص کی شراب میں
مور مست ہو گیا
سانپ جیسے سو گیا
عکس ماہتاب میں
ایک پیکر گداز اور ناچنے لگا
ڈھولکوں کی مست چیخ اور تیز ہو گئی
جنگلی حسینہ اور شعلہ ریز ہو گئی
مورتی کا دیوتا خود ہی مسکرا اٹھا
اور جیسے چونک کر
رقص بند ہو گیا
کس قدر غرور تھا
کامیاب رقص پر۔

مختار صدیقی

قریۂ ویراں

جھلسے پیڑ، جلی آبادی، کھیتی سوکھی، خرمن راکھ
ہست و بود کا مدفن راکھ
گرتے بام و در کے لیے ہے گلیوں کا آغوش
جیسے یہ دیواروں کو تھے کب سے وبالِ دوش
بار ہٹا تو آیا ہوش

پنگھٹ اور چوپال بھی سونے، راہیں بھی سنسان
گلیاں اور کوچے ویران
جھونکے سوکھے پتے رولیں، بکھری راکھ اڑائیں
راکھ اور پتے بن کے بگولے، اپنا ناچ دکھائیں
اور وہیں رہ جائیں

یہ بستی اب توڑ چکی ہے ہستی کی زنجیر گراں
اور قیود زماں و مکاں
وقت کے ڈاکو جکر اس کو بساط مطابق لوٹ چکے
اس کے لیے ماحول و فضا کے سارے بندھن ٹوٹ چکے
ماضی و حال بھی چھوٹ چکے

کون آئے جو آ کر اس میں زیست کے رنگ بھرے
کھیتوں کو سرسبز کرے
گلی گلی اور کوچہ کوچہ ، پنگھٹ اور چوپال
کھیلتے بچوں ، ہنستی جوانی سے کر دے چونچال
زندہ کر دے ماضی و حال

بَرف باری کی ایک رات

(۱)

شام ہوتے ہی بپھرنے لگا یخ بستہ ہوا کا طوفان
اور پھر برف کی زد میں چھپی وادیوں، باغوں پہ
چھا گیا ہُوکتی، غرّاتی ہواؤں کا جنوں

سر بر آوردہ، اٹل چوٹیاں، مضبوط تناور دیودار
کانپ کانپ اٹھے — گرجتی ہواؤں کا یہ اندھا لشکر
اب کی یلغار میں کس کس کو کرے خوار و زبوں

(۲)

جانبِ غرب سے پھر اُٹھی وہ مٹیالی غضبناک اکیلی بدلی
حاشیے پر کی چمکتی ہوئی جدول میں عجب شان کی وحشت خیزی
خوف سے ابر بھی طوفانی ہوا بھی سہمی
خوف سے ساری فضا گنگ ہوئی
چار سو چھا گیا بے پایاں خموشی کا فسوں
بانٹتی سرد ہواؤں میں گھلے سناٹے
وادیاں، دامنِ کہسار، تناور دیودار
دم بخود ہو گئے لہرا کے جو کر سے بہکے

(۳)

اور پھر کہرے امنڈنے لگے اور برق ہوئی نعرہ زناں
آن کی آن میں چاندی کی سبک تتلیاں سیماب کے نازک پارے
وادیوں، چوٹیوں، جھیلوں پہ گرے۔ گرتے رہے

پھر ہر اک سمت یہی بانکی پھواریں، یہ کجیلی، یہ روپہلی بارش
گہرے سناٹوں کی مخموری سی گرمی میں یہ مرمرے ترشے تارے
ہانپتے جھونکوں کے شانوں سے اتر کر برسے
وادیوں، چوٹیوں، جھیلوں پہ گرے، گرتے رہے

(۴)

صبح ہونے پہ تھی ان دیکھی تجلّی کی ہر اک سمت منزہ تابش
بے اماں عصمت و تقدیس میں انگڑائیاں لیتا ہوا حسن
حکمراں چارسو، بے پایاں جنوں خیز جمال
خیرہ کن، نورِ سماوات سے بھرپور جلال!!

اناؤنسر

سرخ بتی نے اشارے سے کہا ہے بولو
کھوج نظروں کا مشاہدات کے بندھن توڑے
میرے الفاظ کی لہروں کا کوئی پیمانہ
چھین لے جائے گا، دوری کے بہانے جھوٹے

منہ سے جو نکلے اسی بات سے ناطہ چھوٹے
دل میں باقی رہے موہوم سا احساسِ زیاں
میں یہ سوچوں کہ ہر اک دشت بھی آبادی بھی
میرے الفاظ کی تشہیر کا دیکھے گی سماں

اور بے نام و نشاں دیکھی نہ بھالی لہریں
ایک عالم مری باتوں کا ڈھنڈورا پیٹیں

رُسوائی

(۱)

ٹیکا لگاؤں مانگ بھی صندل سے بھر چکوں
دلہن بنوں تو چاہیے جوڑا سہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی امد لہر
افشاں ہے بخت بھی کر رہا ان کے پھیر میں
کہتی ہے سانجھ بھور کے اب گھاٹ اتر چکوں
تم بیٹھو، میں تو آئی، پہ جی سے گزر چکوں

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے حشر اٹھائی کی
پائل بجے تو بنسی کی دُھن ناچ ناچ اٹھے
بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں
دیدے گھما گھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں
ان کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں
بپتا نہ ہو گی کل سے لگائی بجھائی کی
دیکھے شفق تو دیکھے چتا جگ ہنسائی کی

(۲)

چیخیں سُن سُن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے
سامنے دہکی ہوئی آگ کا پیکر دیکھا
چل کے دو چار قدم پھر سے پلٹ کر جو لاں

چیخیں شعلوں کے دہکنے پہ لپک اٹھتی تھیں
دود کے حلقے، رواں سوئے فلک چرخ زناں
سب یہ سمجھے کہ کوئی غول جیالا بانی ہے
یونہی لوکا جو لگانے کو نکل آیا یہاں
بادیا آگ تھی یا لال رسیلی ساڑی
چھایا کالوں کی تھی شعلوں کی زبانوں کا دھواں
یک بیک کندنی باہیں بھی اٹھیں چیخ کے ساتھ
کانپتے آئے نظر پھول سے مہندی بھرے ہاتھ
ایک نے بڑھ کے وہیں آگ پہ ڈالا پانی
آگ یوں پانی کی شہ پائے تو دوزخ نہ بنے؟
جیتے جی اشکوں سے کیا دل کی لگی بجھتی تھی
آگ پانی میں لڑائی جو چِتا پر بھی ٹھنے؟
خاک ڈالی تو ہوئیں پھر کہیں مدھم آنچیں
بخت رسوا ہو تو رسوائی بنا کیسے مٹے
پوچھو جلنے کی تو جانے وہی جس تن لاگے
چیخیں سن سن کے

کھنڈر

نہ یہ فنا ہے، نہ یہ بقا ہے
میانِ بود و عدم یہ کیسا طویل وقفہ ہے
جو نوشتہ ہماری قسمت کا بن گیا ہے
کنارِ دریا کبھی یہ بستی تھی —
لیکن اب نیستی و ہستی کے درمیاں اک مقام برزخ ہے
ایسا برزخ کہ جس میں صدیوں سے کاخ و کو، بام و در، مسلسل
شکستگی، خستگی، خرابی میں خیرہ سر ہیں

حدودِ ہستی سے ہم نکل کر کھنڈر بنے تھے
مگر کھنڈر بن کے مٹ بھی جاتے
کہ یہ غمِ زندگی کے رسیا
ہماری ہستی کو اپنی یادوں سے محو کر دیتے، بھول جاتے
نہ یہ کہ ہم کو تماشہ گاہِ جہاں بناتے
ہمارے عبرت کدوں کو محفوظ کر کے رکھتے
نہ یہ کہ آبادیوں کی خاطر
ہماری بربادیوں کو "تاریخی یادگاریں" بنائے رکھتے
وہ "یادگاریں"
جہاں پہ یہ لوگ .... زندگی کے اجارہ دار آسکیں تو آئیں
دنوں کو راہوں کی خاک اڑائیں
وہ بارگاہیں جو عرش پایہ تھیں واب و آدابِ خسروی میں

وہاں یہ دندان گھستے جائیں
جہاں بھی جی چاہے اپنا نام اور شعر لکھیں
مچائیں غوغا، رکیک، بے معنی گیت گائیں
مگر نہ اوقاتِ پنجگانہ میں
ایک بھی وقت سونی مسجد میں جھانک پائیں
کسی کی تربت پہ فاتحہ کے لیے نہ یہ اپنے ہاتھ اٹھائیں
دنوں کو یونہی فسردہ راہوں کی خاک اڑائیں
دیے جلے پر گھروں کو جائیں
ہماری ویرانیوں کو ویران تر بنا کر چلے ہی جائیں
یہاں پہ چھا جائے اندھیاریوں کا پھر وہ سکوت جامد
کہ بوم و شپّر ہی جس کے ہم راز و ہم نفس ہیں
نہ دن کی وحشت میں کچھ کمی تھی
کہ شب کی دہشت میں کچھ کسر ہو
ہمارے دن رات ایک سے ہیں
ہمارے دن رات اسی وجود و عدم کے اک وقفۂ مسلسل میں
ہستی و نیستی کے برزخ میں پابہ گل ہیں
ہمارے دن رات اسی ورائے زمان وقفے سے متصل ہیں
مگر ہمیں کب ملے گی اس دام سے رہائی ؟
ہمیں ملے گا عدم کی معدوم و بے نشاں گود کا سکونِ ابد خدایا ؟
ہمیں ازل اور ابد کے چکر سے کب عطا ہوگی رستگاری !
خدائے قیوم و حیّ و قائم
جنابِ باری ! ——

(طویل نظم "ٹھٹھہ" سے)

اختر الایمان

پگڈنڈی

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیسے یونہی بڑھتے بڑھتے رنگ افق پر جا چھو لے گی
جیسے یونہی افتاں خیزاں جا کر تاروں کو چھو لے گی
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی، بل کھاتی، ویرانوں سے، آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں سستاتی، مڑتی، بڑھ جاتی ہے آزادی سے

راہی کی آنکھوں میں ڈھلتی، گرتی اور سنبھل جاتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں میں تاروں کی سیمیں خواب کا دھارا بنتی
دن کی روشن قندیلوں میں، میداں میں آوارہ بنتی
ندیوں سے، چشموں سے ملتی کوسوں دور نکل جاتی ہے

پھولوں کے اجسام کچلتی، ذروں کے فانوس جگاتی
درماندہ اشجار کے نیچے شاخوں کا واویلا سنتی
ہر نووارد کے رستے میں نادیدہ اک جال سا بنتی
بڑھ جاتی ہے منزل کہہ کر کلیاں زیرِ خاک سلاتی

غم دیدہ پس ماندہ راہی تاریکی میں کھو جاتے ہیں
پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بناتے ہیں
آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں
وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہو جاتے ہیں

راہ کے پیچ و خم میں اپنا دامن کوئی کھینچ رہا ہے
فردا کا پرپیچ دھندلکا، ماضی کی گھنگھور سیاہی
یہ خاموشی، یہ سناٹا، اس پر اپنی کور نگاہی
ایک سفر ہے تنہا راہی، جو تنہا تھا خوب سہا ہے

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یونہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

یہ سورج، یہ چاند ستارے راہیں روشن کر سکتے ہیں؟
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے؟
آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں ہے؟
ہم سے اتنا بن پڑتا ہے جی سکتے ہیں، مر سکتے ہیں

عہدِ وفا

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشم نم ہو، یہاں اب سے کچھ سال پہلے مجھے ایک چھوٹی سی بچّی ملی تھی، جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا بیٹی! یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو، مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر وہ کہنے لگی: میرا ساتھی، اُدھر، اُس نے انگلی اٹھا کر بتایا، اُدھر، اس طرف ہی جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی!

تبدیلی

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سرپھرے"
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سنیں اور کہیں
اور اس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رخ موڑ لے

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عُریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اُڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مُڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد، سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں

اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اُس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بستر کمخواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے، یہ خیمۂ افلاک کا سایا
اسی کی بخششیں ہیں، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حد فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے، خاک اسفل سے
مری تخلیق کی، مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادر مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں، اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اُسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اُسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا، دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے، میرے قبضے میں
بجز اک ذہن رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی، مگر مجھ کو

خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اُٹھاتا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گاتا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکراتا ہے
وہ خامہ سوزیِ شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکّے کی طرح سب کو دکھاتا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبحگاہی کی طرح، لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو، کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

بازآمد

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہو جو
کان میں کہنی ہو خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات

دھوپ میں تیزی نہیں
ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دست شفقت ہو بڑی عمر کی محبوبہ کا
اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے
جیسے میں نیند میں ہوں

عورتیں چرخے پہ بیٹھی ہیں
کچھ کپاس اوٹتی ہیں
کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں
جیسے یہ کام ہے در اصل ہر اک شے کی اساس
ایک سے ایک چہل کرتی ہے
کوئی کہتی ہے "مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکاری مری ساس"
کوئی کہتی ہے "بھری چاندنی آتی نہیں راس"

رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
بات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
"لذت وصل ہے آزار" کوئی کہتی ہے
"میں تو بن جاتی ہوں بیمار" کوئی کہتی ہے
میں گھسا آتا ہوں اس شیش محل میں دیکھو
سب ہنسی روک کے کہتی ہیں "نکالو اس کو"

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں
ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب
پوری قوت سے کوئی گیند اچھالے جیسے
اک پھدکتا ہے ہر اک شاخ پہ جس طرح کوئی
آمد فصل بہاری کی خوشی میں ناچے
گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے
نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں
اور کل ہاتھ ہوئے ہیں پیلے

کوئلیں کوکتی ہیں
جامنیں پکی ہیں، باغوں پہ بہار آئی ہے
ارغنوں بجتا ہے یکجائی کا
نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو ادھر
ساونی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملا کر ہر سو
اور اس آواز سے گونج اٹھی ہے بستی ساری
میں کبھی ایک، کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں
ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں
آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر

"کیوں حبیبہ نہیں آئی اب تک ؟"
کھلکھلا پڑتی ہیں سب لڑکیاں سُن کر یہ نام
"لو یہ سپنے بن ہیں" کہتی ہے کوئی
"باؤلی! سپنا نہیں شہر سے آئے ہیں ابھی"
دوسری ٹوکتی ہے
بات سے بات نکل چلتی ہے
"ٹھاٹ سے آئی تھی بارات" چنبیلی نے کہا
"بینڈ باجا بھی تھا" دیپا نے کہا
"اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر؟"
کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف
اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی کہ نہیں
جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری
"کیوں نہیں بہتی" چنبیلی نے کہا
"اور وہ برگد کا گھنا پیڑ، کنارے اس کے؟"
"وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی"

وعدہ کر کے جو حبیبہ نہیں آتی تھی کبھی
آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جا کر
اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

ماہ و سال آتے چلے جاتے ہیں
فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے
کوئی روتا نہیں اس موقع پر
حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں
کوئی زنجیر نہ ہو

زیست ور زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے

بھیڑ بچوں کی ہے چھوٹی سی گلی میں دیکھو
ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے
میں نے جا پکڑا اُسے، دیکھی ہوئی صورت تھی
"کس کا ہے؟" میں نے کسی سے پوچھا
"یہ جمیلہ کا ہے!" رمضانی قصائی بولا
بھولی صورت پہ ہنسی آگئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے
دیر تک ہنستے رہے!!

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہو جو
کان میں کہنی ہو خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات

مجید امجد

اِمروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی ان سُنی دائمی راگنی کی کوئی تان — آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو آکر مری اُلجھی اُلجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد
طلوع و غروبِ مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار گھڑیاں
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا روماں، یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے۔ اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں ہوں میں
یہی میرا حصہ — ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ

مجھے کیا خبر وقت کے دیوتا کے حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے، زمانے کے ہنگامے، صدیوں کے صدہا ہیولے
مجھے کیا تعلق مری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر — جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے
مرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لیے اس خراباتِ شام و سحر میں، یہی کچھ
یہ اک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی، یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بہ دورِ حیات آگئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت پر چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا، جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
ابھی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

آٹو گراف

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر حسین لڑکیاں

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
ابل پڑے الجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے، بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی راستے پہ اک طرف
بیاض آرزو بکف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بدم
کمان ابرواں کا خم
کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

کوئی جب ایک ناز بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا

حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

وہ بادلہ، وہ ایک مہوشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر
بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری،

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پابہ گِل
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے

بس اسٹینڈ پر

"خدایا اب کے یہ کیسی بہار آئی"
"خدا سے کیا گلہ بھائی !....."
خدا تو خیر کس نے اس کا عکس نقش پا دیکھا
نہ دیکھا بھی تو دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا
مگر توبہ مری توبہ، یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محروم زنخداں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ردائے صد زماں اوڑھے، لرزتا، کانپتا، بیٹھا
ضمیر سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا"

"مگر اب تو یہ اونچی مٹیوں والے جلوخانے میں بستا ہے"
"ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شے اس کی — ہم کیا ہیں
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں!"

"ہماری ہی طرح جو پائمال سطوت میری و شاہی ہیں
لکھوکھا پا پیادہ، آبدیدہ، دل زدہ، واماندہ راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیما لکیروں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں"

"ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
بسے گی اک نئی دنیا، سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں، گلستاں میں نیا موسم"

"وہ رُت اے ہم نفس! جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نومبر کی بس جانے کب آئے گی"

ہیولیٰ

برگ دبر پر، بام و در پر، برف برف
کوئی نگری، کوئی نگری، برف ... برف!
زرد سورج۔ سیمگوں میداں۔ روپہلی سیڑھیاں
سیڑھیوں کی موج اندر موج ڈھلوانوں پہ چہرے، چتر چتر
سیڑھیوں پر سو قمر قوسِ آئینوں کی اوٹ اوٹ
منتظر نظروں کی دنیا عکس عکس

کتنے رنگوں سے جو زیبِ دامنِ احساس تھے
بھر گئے تھے سیڑھیوں تک راستے
جانے کس کے واسطے
ساز جاگے، پھول برسے، اک نوا،
اک صدا، جیسے سلگتی چاہتوں کے دیس سے آتی صدا
اک صدا، جیسے زمانوں کے اندھیروں میں صدا دیتی وفاؤں کی صدا
اک صدا، جیسے مرے دل کی صدا ــــ

لے بجھی اور نغمہ گر کا پیکرِ بے جاں گرا
سیڑھیوں سے آسماں کی ٹوٹتی محراب تک
بکھرے پھولوں کی چٹختی پنکھڑیوں پر تیز قدموں کی دھمک

آہٹوں کے اس بھنور میں اک جھجکتی چاپ کی دھیمی جھنک
میرے دل کی دھڑکنوں کو روندنے والی کسک

رات، بجھتی شمع، نیندوں کا غبار
برف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جھونکوں کی بزم
میں کہاں تھا — کچھ بتا — اے دل کی لو پر ناچتی ناگفتہ نظم

توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے، چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر اک جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل!

منیب الرحمٰن

بازدید

تم جو آؤ تو دھندلکے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیفِ سرِ شام لیے
جب لرزتے ہوں صداؤں کے سمٹتے سائے
اور آنکھیں خلشِ حسرتِ ناکام لیے
ہر گزرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خود فریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں

تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ
مستیٔ بادِ سبک گام لیے
شبنمی شیشوں کو سہلائیں لچکتی شاخیں
اور مہتابِ زمستاں کوئی پیغام لیے
یوں چلا آئے کہ در باز نہ ہو
کوئی آواز نہ ہو

تم جو آؤ تو اجالے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی لذتِ انجام لیے
جب تمنائیں کسی خوف سے چیخ اٹھتی ہیں
اور خاموشیٔ لب سیکڑوں ابہام لیے
ایک سنگین حقیقت میں بدل جاتی ہے
زندگی درد میں ڈھل جاتی ہے

آئینہ

دن نکلتے ہی آئینہ بولا
آؤ بے روک ٹوک آجاؤ
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے
میں ہمیشہ سے جانتا ہوں تمھیں
پھر تعارف کی کیا ضرورت ہے

ایک دن ایک طفلکِ معصوم
میری آغوش میں مچلتا تھا
وہ سماں تم کو یاد ہو کہ نہ ہو

شام کو راہ سرد و ویراں پر
ایک سایہ قریب آتا ہے
اور کہتا ہے آؤ ساتھ چلیں
پاس کے ریستوراں میں چائے پئیں
اور میں پوچھتا ہوں کیا تجھ سے
آشنا ہیں تمام اہلِ جہاں
میں کبھی عکس ہوں کبھی سایہ
اصل کی جستجو میں سرگرداں
خود کو پہچاننے میں عمر گئی
اور اپنے لیے میں غیر رہا
سب نے دیکھا مجھے مگر میں ہی
اپنی صورت کبھی نہ دیکھ سکا

برگد کا پیڑ

آنکھیں میچے سوچ میں گم
دھونی رمائے کوئی سادھو جیسے بیٹھا ہو
بچے کھیل رہے ہیں
جن کی چیخوں سے
خاموشی کے ساکن جوہڑ میں ہلچل
جھونکے آتے ہیں
لیکن یہ چُپ سادھے رہتا ہے
موت بھی شاید اس کے بڑھاپے کو چھونے سے ڈرتی ہے
اس کا تن ماضی سے بوجھل ہے
اور ہمارے دن اس کے بھاری پن کو
سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہے ہیں
اس کے پتوں نے کیوں ہر کونپل کو ڈھانپ رکھا ہے
اس کی شاخیں کیوں مٹی میں گھس کر جڑ بن جاتی ہیں

سنتھالی ناچ

یہ چٹانوں کے بھنور ہیں
جن سے ظلمت چیختی ہے
آندھیوں کے دل کی دھڑکن
دیوداروں کے تنوں میں
مست شیروں کی گرج ہے
جنگلوں میں
مور چھل، نیزے، کمانیں
لذتوں کے منھ سے باہر تند شعلوں کی زبانیں
عورتوں کی آبنوسی چھاتیوں سے
درد بن کر زہر کی بوندیں گریں گی
ان کی رانیں تشنۂ پیکاں رہیں گی
اور وحشت سنگریزوں پر چلے گی
خون بن کر تال دے گی

تم اپنے خواب گھر پہ چھوڑ آؤ

تم اپنے خواب گھر پہ چھوڑ آؤ
نہیں تو خار بن کر یہ چبھیں گے
تمھاری روح کو پیہم ڈسیں گے
مبادا یہ تمھارا منھ چڑھائیں
تم ان سب آئینوں کو توڑ آؤ

تم اپنی عقل و منطق پر ہو نازاں
یہ ناخن اس جگہ کیا کام دیں گے
جہاں دل کی گرہ الجھی ہوئی ہو
تمھارے ہاتھ اپنی بے بسی پر
تمھیں ہر گام پر الزام دیں گے

کہاں ہیں وہ کتابیں، وہ صحائف
کہ جن میں زخم اپنے رکھ دیے تھے
اُس انساں نے جو شعلوں میں جلا تھا
اُس انساں نے جو سولی پر چڑھا تھا
اُس انساں نے جو مر مر کر جیا تھا

تم اپنے خواب گھر پہ چھوڑ آؤ
تمھاری دھوپ سایوں میں ڈھلے گی

تمھاری رات شبنم پر چلے گی
ہمیشہ زہر آلودہ سے چھینٹے
نہ رنگیں گے تمھاری بے حسی میں
تمھارا تن تمھارا تن رہے گا
تمھارا دل تمھارا ساتھ دے گا
تمھیں کیا چاہیے پھر زندگی میں
تم اپنے خواب گھر پر چھوڑ آؤ

دھول ایسا رستوں میں...

دھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں

کہیں کسی تاریک گلی میں کوئی
میرے پھیلے ہاتھ کے نقش سے گھبرا کر
لہراتے دامن کو تھامے چلتی ہے

کہیں کسی دہلیز سے ابھری پیشانی پر
آتے جاتے پاؤں چھن بھر کو رکتے ہیں
یا پھر اک خاموش آنگن میں
آپ سے آپ مرے قدموں کی آہٹ
گونجنے لگتی ہے
اور کوئی کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے
یا پھر رات گئے ٹمٹماتے تاروں میں اچانک
دل پر ہاتھ رکھے کوئی اٹھ بیٹھتی ہے
رگ رگ میں میرے دل کی دھڑکن کو سننے لگتی ہے

لیکن آنکھیں پیاسی ہیں
اور دھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں

جادۂ جاوداں

گزشتنی ہے سحر بھی، شب بھی
گزشتنی ہیں بسنت، برسات، پوس، پت جھڑ
رُتوں کے یہ سارے قافلے اور ساعتوں کے یہ سب مسافر
ہواؤں کے ساتھ آتے جاتے رہیں گے یونہی
مگر یہ تکرار آمد و رفت اک تسلّی سے بیشتر خاک بھی نہیں ہے
کہ وقت تو ایک جادۂ نارسا کی مانند جاوداں ہے

ہوا کی باتوں میں کتنی یادوں کی لرزشیں ہیں
ہوا کے انداز ان گنت ہیں
ہوا کبھی رنگ و نور سے پیکر تمنّا
کبھی اندھیرے میں ایک ہمدرد ہاتھ کا لمس، ایک سسکی
ہوا کی رفتار تیری موجودگی کی مانند زندگی ہے
یہ تیری موجودگی تسلّی سے بیشتر خاک بھی نہیں ہے
کہ تیری موجودگی کی تہہ میں
وہ آرزوئیں بھی موجزن ہیں
جو باہمی فاصلوں کی وسعت بنی ہوئی ہیں
کہ ہم تو بس ناتی ہیں اپنے
کہ ہم تو اپنی ہی آرزوؤں کو پوجتے ہیں
کہ ہم تو اپنے بس آپ بُت ہیں

وہ آرزوئیں جو ہم کو ہر لمحہ کر رہی ہیں
وہ آرزوئیں گزشتنی ہیں
یہ سارے لمحے گزشتنی ہیں

جو لفظ تو آج کہہ رہی ہے
یہ وہ نہیں ہیں جو پیشتر تھے
وہ لفظ دہرائے بھی اگر تو
تو ان کا مطلب وہی نہ ہوگا
بدلتی رہتی ہیں رہگزاریں
بدلتے رہتے ہیں راہرو بھی

خزاں زدہ شاخ گرتے پتوں سے کہہ رہی تھی :
مری رگوں کے لہو میں حدت رہی جہاں تک
میں تم کو سینے کے ساتھ چمٹائے شادماں تھی
پہ اب تمھارے بڑے جنازوں پہ رونے والا کوئی نہ ہوگا
لہو کی حدت گزشتنی ہے
ہر اک محبت گزشتنی ہے

مگر وہ پتے یہ کہہ رہے تھے :
نئی رتیں پات بھی نئے لے کے آئیں گی صرف ہم نہ ہوں گے
کہ دائمی زندگی ہے ، بس ہم گزشتنی ہیں

وہ پھول لمحے
جب اپنی اپنی تلاش میں ایک دوسرے تک پہنچ گئے ہم
وہ پھول لمحے گزر گئے ہیں

مگر ابھی تک ہوا میں ان کا اثر ہے باقی
ابھی وہ خوشبو یہیں کہیں ہے
تو اور میں اب تو محض بیتی کہانیاں ہیں
مگر وہ خوشبو
وہ مد بھری خود سپردگی کی لذیذ خوشبو یونہی رہے گی
کہ صرف تخلیق دائمی ہے
بس اپنی تخلیق دائمی ہے

ہوا کے جھونکے، بکھرتے پتّے، گزرتے لمحے یہ کہہ رہے ہیں
تمھارے رس رنگ آنے والے نئے گلوں کی امانتیں ہیں
ہمارے ہمراہ تم بھی آؤ
نئی رُتوں کو نئے گلوں کے سپرد کر کے
کہ یہ بہاریں گزشتنی بھی ہیں دائمی بھی

ٹائپسٹ

دن ڈھلا جاتا ہے، ڈھل جائے گا، کھو جائے گا
یہ جو در آئی ہے اس درز سے اک چور کرن
دیکھ کر میز کو، دیوار کو، الماری کو
فائلوں، کاغذوں، بکھری ہوئی تحریروں کو
پھر اسی درز سے گھبرا کے نکل جائے گی

اور باہر وہ بھلی دھوپ، ملائم کرنیں
کھیلتے ہنستے جو بالوں سے لپٹ جاتی ہیں
پیارے جسم کو، رخساروں کو سہلاتی ہیں
پاس ہی پیڑ پہ ہُد ہُد کی کھٹا کھٹ، کھٹ کھٹ
اور نڈھال انگلیاں کہتی ہیں تھکا تھک، تھک تھک
محض ابجد کی بدلتی ہوئی بے حس ترتیب
زندگی سلسلۂ شدتِ جذبات نہیں
اور جذبات، یہ بیکار کھلونے کس کام
آپ ہی آپ بھڑک اٹھتے ہیں، کھو جاتے ہیں
آپ ہی آپ الجھ جاتے ہیں، سو جاتے ہیں
خود بخود چاہتیں سنولا کے بکھر جاتی ہیں
ساتھ ساتھ آئے ہوئے بھوت کی صورت خدشے
سرد ہاتھوں سے کبھی پاؤں جکڑ لیتے ہیں
اور کبھی سایوں کی دیوار اٹھا دیتے ہیں

میں نے دیکھے ہیں تمناؤں کے بنجر انجام
میں نے دیکھا ہے کبھی گھر کے جب آئے بادل
چیخ اٹھے لوگ کہ اب کھیتیاں لہرائیں گی
وائے خوابوں کے بن بن کے بگڑتے ہی رہے

اک توقع پہ سنورنے لگی پھر سوچتی شام
کس کی آنکھوں کی چمک راستہ دکھلاتی ہے
پھر وہی کھلتے ہوئے در کی طرح خندۂ لب
کہے جاتا ہے چلی آؤ، چلی بھی آؤ
لیکن اس خندہ کے اس پار نہ گھر ہے نہ سکوں
"یوں تو میں صرف تمھارا ہوں مگر کیا کیجے
بعض مجبوریاں ــــ" "مجبوریاں؟ میں جانتی ہوں
جانتی ہوں کہ گئے وقت کو روکا کس نے
وقت آتا ہے گزر جاتا ہے بس دور ہی دور
ایک دن وقت بڑے چین سے سو جائے گا
دن ڈھلا جاتا ہے، ڈھل جائے گا، کھو جائے گا"

قہوہ خانے میں

اس آرزو میں کہ اپنے سینے کا بوجھ پل بھر اتار پھینکوں
میں اپنی ہر شام قہوہ خانوں میں کاٹتا ہوں
یہ قہوہ کڑوا سا ہے مری سوچ کی طرح، پھر بھی پی رہا ہوں
یہ قہوہ خانوں کا شور شاید کبھی مجھے خود میں جذب کرلے
میں اپنی تنہائیوں کو قہوے کی پیالیوں میں ڈبو رہا ہوں

یہاں پہ میں ہی نہیں ہوں، مجھ سے یہاں کئی ہیں
یہ کھوکھلے چہرے جن کی نظریں فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں
یہ لوگ ہنستے ہیں لیکن ان کی ہنسی میں رنگِ طرب نہیں ہے
ہر ایک چہرے پہ اک نقابِ وفا ہے لیکن وفا کہاں ہے
یہ چہرے جذبات کا مرقع ہیں لیکن ان کے سیہ دلوں میں
بس اک گھنی تیرگی ہے، کوئی کرن نہیں ہے کہ جگمگائے
میں خود کو اس جمگھٹے میں گم کرتا جا رہا ہوں
یہ میرے ساتھی ہیں ان سے میں تنگ آچکا ہوں
میں خود سے ملنے کا آرزو مند ہوں مگر خوف کھا رہا ہوں

یہ میرے ساتھی
(ونڈ چیٹر کے کالر اوپر اٹھے ہوئے ہیں)
بہم دگر گفتگو میں مصروف جا رہے ہیں

کبھی ارسطو کے فلسفے میں اُلجھ رہے ہیں
کبھی حکومت بدل گئی ہے تو پھر ہمیں کیا
ہمیں تو اس زیست کے بدلنے کی کوئی امید ہی نہیں ہے"
کبھی فقط ایک عارضِ تازہ کی جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہیں
مگر کسی بات میں تسلسل نہیں ہے، ذوقِ نظر نہیں ہے
میں زیست کی تلخیوں کو تھوڑے کی پیالیوں میں ڈبو رہا ہوں

(طویل نظم "زمستاں کی شام" سے)

ساحر لدھیانوی

مرے عہد کے حسینو!

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے الجھیں
کبھی سوگوار سوئیں، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا ہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسین نور زادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ
جنھیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنھیں کمسنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کرلیں
جنھیں مہوشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کرلیں
جنھیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پر سجائیں
جنھیں بت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں انھیں پاس لا کے پوجیں
جنھیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرولیں
جنھیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمولیں

جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاکِ بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینو: وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمہیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے
مرے ساتھ رہنے والو، مرے بعد آنے والو
مرے دور کا یہ تحفہ تمہیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گل عذار آئے

کیفی اعظمی

ایک لمحہ

جب کبھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
خشک خشک ہونٹوں میں جیسے دل کھنچ آتا ہے
دل میں کتنے آئینے تھرتھرانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
ذہن جاگ اٹھتا ہے، روح جاگ اٹھتی ہے
نقش آدمیت کے جگمگانے لگتے ہیں
لَو نکلنے لگتی ہے مندروں کے سینے سے
دیوتا فضاؤں میں مسکرانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
تشنہ تشنہ گیتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

پرویز شاہدی

بے چہرگی

ہزار پوست استخواں
ہزار لب فسردگی
ہزار پردہ تشنگی
ہزار شاخ بے دلی
ہزار عشوہ خودسری
ہزار غمزہ عاجزی
ہزار پیچ آگہی
ہزار عقدہ ابلہی
ہزار لہجہ خامشی
ہزار مرگ زندگی
غرورِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کمتری
یہ ریزہ ریزہ آدمی
یہ پارہ پارہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
معاشیاتِ حرص کا ابھرتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے
نظامِ بے مہار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار چہرہ آدمی
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں

ابھی یہاں
ابھی وہاں
نہ کوئی سمت ذہن میں
نہ کوئی راہ سامنے
فقط فریب کاریِ انا کی گرد اوڑھ کر
کبھی ہے دوڑتا اِدھر
کبھی ہے بھاگتا اُدھر
ہو کون اس کا ہمسفر
خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ کھو گیا
دوبارہ وہ ملے گا کیا
تعاونِ آئینہ کا بھی فریب ہی فریب ہے
نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہے
خود اپنے چہروں کا ہجوم ورطۂ نگاہ ہے
نہ کوئی نقش منفرد
نہ کوئی عکس معتبر
ہزار چہرہ آدمی
ہزار چہرگی لیے
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو . . . .
چہرہ چاہیے
خود اپنا چہرہ چاہیے
وہ اصلی چہرہ چاہیے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں

احسن احمد اشک

ڈرامہ

دوش پر ہابیل کی لاش اٹھائے ہوئے سوچ میں قابیل ہے خوں چھپائے کہاں؟
سخت بہت ہے زمیں، دور بہت آسماں

راہ نما، پیشوا، رشی منی، دلیا، مصلحین و انبیا، عاقبت و آخرت
فطرتِ گمراہ پر کتنی ہی پابندیاں

نیند میں سقراط ہے زہر کا پیالہ پیے، جرم ہے اعلان حق اس کی سزا مختلف
خواریاں، رسوائیاں، دار و رسن، بیڑیاں

شیش محل کی فضا، سنوری ہوئی کہکشاں، تخت پہ بیٹھے ہوئے نادر و چنگیز خاں
ساز و دف و چنگ پر رقص کناں مہ وشاں، صندل و کافور کی ترشی ہوئی پنڈلیاں،
راجکماروں کی بھیڑ، سیناپتی، رانیاں، باادب و باخبر خواجہ سرا، لونڈیاں
شاعروں بھاٹوں کی بھی مدح سرا ٹولیاں

پالکیاں، ڈولیاں، پردہ نشیں بیبیاں، کٹنیاں، شہزادیاں
چھپ کے نظر بازیاں

جاگے ہوئے میکدے، سوئی ہوئی بستیاں، رات کے سناٹے میں سازشیں سرگوشیاں
ڈاکہ زنی، چوریاں

حسن کے بازار میں نائکہ اور نوچیاں

موٹریں، اسکوٹریں، رات، کلب، ناچ گھر، گودی جواں ناریاں، مکی بھری گڑیاں
مستیاں، انگڑائیاں، مسکی ہوئی چولیاں
ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

کوروں کی پانڈوں کی جنگ، بیر جیالے جواں، موت کے جھنڈے لیے آگ کے رتھ پر سوار
آگ کی اور خون کی بہتی ہوئی ندیاں
نینوا، الجیریا، کانگو اور کوریا
جلتے ہوئے شہر اور جلتی ہوئی بستیاں

علم ارسطو تمام سیلِ سکندر میں گم

والٹیر، بوعلی، بے وطن و دربدر، لارڈ رسل، سارتر، فکرِ غلط بے اثر
رابعہ، طاہرہ بن کو بسائے ہوئے، گوتم و عیسیٰ کے بت خوں میں نہائے ہوئے
روحِ محمد خجل، بولہبی حکمراں

کانفرنس، مشورے، پنچ شلا، یا آلیا، شانتی کے نام پر اور بھی خونریزیاں
دامنِ تہذیب پر اور بھی گلکاریاں
اور بھی بربادیاں
پھر نئی آبادیاں

بند بھی کرلوں اگر آنکھ کی یہ کھڑکیاں، وقت کے اسٹیج پر صبحِ ازل سے رواں
ایک سی پرچھائیاں، ایک سی پرچھائیاں

تسکینِ انا

جب کوئی قرضِ صداقت کا چکانے کے لیے
زہر کا دُردِ تہِ جام بھی پی لیتا ہے
اپنا سر ہنس کے کٹا دیتا ہے
زندگی جبر سہی، جبر مسلسل ہی سہی
سہتا ہے
اور اس جبر کو سو رنگ عطا کرتا ہے
حرف کا، صوت کا، صورت کا، فسوں کاری کا
میں اسے دیکھ کے چپکے سے کھسک جاتا ہوں
یہ تو میں خود ہوں وہ احمق جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

تم کس سے ملنے آئے ہو

تم کس سے ملنے آئے ہو
کس چہرے سے کام ہے تم کو
کن آنکھوں سے بات کرو گے

تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو
اس میں ہیں کتنے ہی چہرے
جن کو لگائے میں پھرتا ہوں
تم کس سے ملنا چاہو گے
اس شاعر سے جس کو تم نے
دیکھا ہے اسٹیج پہ اکثر
سب کو بھولے، خود کو بھلائے
بدمستوں کا بھیس بنائے
جس نے فلک پر حکم چلائے
سنگِ ملامت جس پر آئے
محفل کی محفل جھوم اٹھی
جس نے ایسے شعر سنائے

تم کس سے ملنے آئے ہو
اس اجلے گورے چہرے سے
جس پر آگ کے پھول کھلے ہیں
جو اک سیدھے قد کو سنبھالے

دل میں سیکڑوں زخم چھپائے
اپنی انا کی لاش اٹھائے
کم ظرفوں کی اس دنیا میں
کتنے یگوں سے سرگرداں ہے

تم کس سے ملنے آئے ہو
اُس انساں سے جس کے اندر
ایک قاتل، زانی، سارق کے
تینوں چہرے ایک ہوئے ہیں
لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہیں
پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں
اور وہ قاتل اب بزدل ہے
اور وہ زانی اب شوہر ہے
اور وہ سارق اب منصف ہے

تم کس سے ملنے آئے ہو
میں خود اپنے آپ سے مل کر
پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں
کس چہرے سے بات کروں

گوپال متّل

ہیرو

حقیر و ناتواں تنکا
ہوا کے دوش پر پرّاں
سمجھتا تھا کہ بحر و بر پہ میری حکمرانی ہے
مگر جھونکا ہوا کا ایک البیلا
تلوّن کیش
بے پروا
جب اس کے جی میں آئے رُخ پلٹ جائے
ہوا آخر ہوا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا تو بے وفا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا پلٹی
بلندی کا فسوں ٹوٹا
حقیر و ناتواں تنکا
پڑا ہے خاکِ پستی پر
خدا جانے کوئی رہگیر جب اس کو مسلتا ہے
تو اپنا خوابِ عظمت یاد کر کے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے

عزیز حامد مدنی

شہر کی صبح

مضمحل، تن بہ تقدیر، ٹوٹی بسوں کی قطاروں سے شورِ فغاں
زخم آلودہ وحشی درندوں کے غوغا کے مانند اٹھا ہے
اور کھرچنے لگی ہے کسیلے دھوئیں کے سیاہ لیپ کو
کوئی تازہ خنک روشنی
رہگزاروں سے
اور اجالے کے دھندلے کناروں سے
کچا دھواں۔ کچھ مکانوں سے اٹھا ہے
نرخِ بازار کا اونگھتا جن
نیم وا، نیم بستہ دکانوں سے اٹھا ہے
رات کی رات ایک حدِ مقتل سے نکلا ہوا شہر،
لوٹا ہے طوقِ گلو لے کے
اک معبدِ زندگی کی طرف
اوک میں کچھ لہو لے کے
راہ میں جاں نثاری کی شاخ ابد آشنا سر جھکائے کھڑی ہے
اک نئے سر سے ذوقِ نمو لے کے

آبادی کے دائرے

اے برادر! رازداں، سکارِ تاری کچھ نہ پوچھ[1]
یہ سرِ قرطاس آبادی کے لاکھوں دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں، کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سردِ تاریکی میں دھندلے دائرے کھوئے ہوئے
بے نکائی کھیتیاں تشکیک کی ہیں دور تک
بیج چوب و دار کے الفاظ میں بوئے ہوئے

دائرے، تاریک، خونیں، آتشیں، ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب اور آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو ——

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی سب کلی
دل زدوں کے دائرے، تیرہ طلب کی بارکیں
رشک کے تاریک کوچے، خوف کی اندھی گلی

ٹین کے ڈبے، پرانی بوتلیں میراث جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں کہ جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

---

[1] یہ مصرعہ بودلیر کے ایک مصرعے کا ترجمہ ہے۔

مہ وشانِ نیم رُخ کے دائرے، عصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریم تنہا نشیں
آتشِ خوابِ زلیخا، روزنِ زنداں کے خواب

اک بدن رقاص حبشی، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جفتی درندوں کی عیاں
مہ وشانِ نیم عریاں کی بلوتی سے کمر

ٹینک سے دبتے ہوئے بیجوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخِ افلاسِ جہاں، لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تریاکی دھوئیں میں ضوفشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں بے تاب، میٹر گنج ہیں محو شمار
پڑھ رہی ہے ایک تحریر رواں میٹر کی آنکھ

ساحلوں کے جن ہیں خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دور تک پٹرول کے چشموں پہ گرگ ریش دار

دائرے زرخیز چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ، دریاؤں کے چہرے آئینے
حلقہ ہائے بادو باراں، کشت و خرمن کے حصار

نیم شب دل میں مگر زم خوردہ سیاروں کے کھیل
بازیٔ چوگاں خداؤں کی بساطِ خاک پر
خون، منھ کو لگ گیا ہے ایسے اوتاروں کے کھیل

وقت بے تقویم کے، ذوقِ جنوں کے رازداں
سر بُریدہ برارتیں روندی ہوئی لاشوں کے خم
زندگی کی موڑ میں یک تیرہ خوں کے خانزداں

اے برادر! یوں نہ جا ان دائروں کے درمیاں
تیرتا ہے اس فضا میں اک ہجوم ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتا ہے دھواں

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا، تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم بے آگاہ میں

آخری ٹرام

آخری ٹرام لڑکھڑاتی ہوئی
شل پریشان، نیند سے بوجھل
زنگ آلودہ بریک کی فریاد
کر گئی چند ساعتوں کے لیے
رہگذر کے سکوت کو آباد
کاسۂ یک خیال کے مانند
نیم روشن سی ایک پالکی
اک نشانِ سوال کے مانند
پوچھتی ہے حسابِ طرز و معاش
اک ہوا ہے جو اس اندھیرے میں
رازِ فطرت کو کر رہی ہے تلاش
دور پرچھائیوں کا اک بن ہے
راہ کی ناف سے سرکتی ہوا
اک طرف روشنی کا دامن ہے
اک طرف عافیت کا سرد حصار
گوشۂ چشم پاسباں کی طرح
عصمتِ زر پہ بینک کی دیوار
وحشتِ دور میں مہیب شورِ سگاں
بے ضمیری ہوا کی کیا کہیے
بے محافظ ہے عصمتِ انساں

خورشید الاسلام

پیاس

دور سے چل کر آیا تھا میں
ننگے پاؤں، ننگے سر
سر میں گرد، زباں پر کانٹے
پاؤں میں چھالے، ہوش تھے گم
اتنا پیاسا تھا میں اس دن
جیسے چاہ کا مارا ہو
چاہ کا مارا وہ بھی ایسا جس نے چاہ نہ دیکھی ہو
اتنے میں کیا دیکھا میں نے
ایک کنواں ہے ستھرا سا
جس کی من ہے پکی، اونچی
جس پر چھاؤں ہے پیڑوں کی
چڑھ کر من پر جھانکا میں نے
جوش و طلب کی مستی میں
کتنا گہرا — اتنا گہرا جتنی ہجر کی پہلی رات
کیسا اندھا — ایسا اندھا جیسی قبر کی پہلی رات
کنکر لے کر پھینکا تہہ میں
پانی کی آواز نہ آئی
اُس کا دل بھی خالی تھا

کمال احمد صدیقی

بادبان

سمندروں کی نیلگوں فضائے آب میں بھی رقص کر چکا ہوں بارہا
مرے لیے کوئی افق — یہ آسماں کی وسعتیں بھی اجنبی نہیں
میں ان میں سیکڑوں، ہزاروں زندگی کے گیت آتشیں دھنوں میں گا چکا

کسی کو ڈھونڈھ ہی رہا تھا — کون جانے کس کو ڈھونڈھتا تھا میں
ہزار بار ڈھونڈتا رہا ہوں جس کو موسموں کے مد و جزر میں مگر نہ پا سکا
ستارے ڈوبنے لگے اور آندھیوں کی شدتیں حباب بن کے رہ گئیں
کسی کو ڈھونڈھ ہی رہا تھا میں سحر کی نرم نرم شبنمیں فضاؤں میں
کہ آپ آ گئیں، اور آ کے چھا گئیں سمندر اور آسماں کی بے کراں خلاؤں میں
ہزاروں داستانیں بحرِ نیلگوں کی چشمِ ناز میں لیے ہوئے
ہزاروں مہر و ماہ کی تجلیوں کا جسم آئینہ بنا ہوا

میں سوچ ہی رہا تھا، لہریں نبضِ کائنات تو نہیں
کہ ایک لہر اٹھی جس کی برہمی کے سامنے مری تمام قوتیں حباب بن کے رہ گئیں
کنارِ آب ایک پل میں دیکھتے ہی دیکھتے میں پھر پڑا ہوا تھا ریت پر
مرے بدن کی ریت کا ہر ایک ذرہ ایک آئینہ تھا
اور جانے کتنے آفتاب جگمگا رہے تھے میرے جسم پر

یہ میرا جسم خاک و خوں کا امتزاج ہی سہی
ہزار میں گناہگار ہوں تو کیا

یہ زلزلے، یہ آندھیاں، یہ برق و آتش و شرر مرے مزاج ہی سہی
مگر سکون پا کے جب بھی شادماں ہوا ہوں
گنگنا اٹھا ہوں، مسکرا دیا ہوں میں
مرے اس آہنی محل کے آستاں پہ آسماں کی جنتیں بھی سجدہ ریز ہو گئیں

گو بہت ہی دور آ چکے ہیں ساحلوں کو چھوڑ کر
اگر نہیں ہیں ناریل کے سائے سطح آب پر تو کیا ہوا
ہوائیں تیز ہیں تو کیا؟ یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا؟
اٹھاؤ لنگر اور بادبان کھول دو
میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، ایک کائنات اور بھی ہے
ماورائے کائنات
برس رہا ہے امرت آسماں سے چاندنی کے روپ میں
زمیں، زمیں کی کائنات کے لیے نمو ہے دھوپ میں
مگر یہ برگ، یہ ثمر، یہ گلستاں بغیر رنگ کے تو کچھ نہیں

ستارے ڈوبنے لگے تو کیا
یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا
اٹھو اور اٹھ کے کشتیوں کے بادبان کھول دو
یہ کون کہتا ہے کہ لہروں کا خدا کوئی نہیں
یہ لہریں خوب جانتی ہیں ساحلوں کا راستہ

منظر سلیم

ذہن کے تجربے

(۱)

بھلا میں اس کش مکش کے دامِ بلا میں کب تک پھنسا رہوں گا
یہ نور و ظلمت کی کش مکش، جھوٹ اور سچ کی یہ کش مکش تو
یہ سلسلہ ہے مہیب خوابوں کا جس کا کوئی سرا نہیں ہے
مہیب خوابوں کا سلسلہ ہے مگر کچھ اتنا حسین و دلکش
کہ اس کی مبہم حقیقتوں کا کسی کو اب تک پتہ نہیں ہے
حقیقتیں، خود فریبیوں کا غلاف جن پر چڑھا ہوا ہے
غلاف کو آدمی کی نظروں نے دور سے بھی چھوا نہیں ہے
کہ لوگ ڈرتے ہیں، سوچتے ہیں کہ اس کے نیچے نہ جانے کیا ہو
کسی شئے غم کا سانپ اب تک یہاں نہ دبکا ہوا پڑا ہو
کسی شئے غم کو چھیڑنے کا کسی کو یاں حوصلہ نہیں ہے
حسیں خیالات کا یہ ماحول مُردہ روحوں کی انجمن ہے
یہاں میں کب تک زمانے کی گردشوں کا ماتم کیا کروں گا
یہ خوفِ دنیا، یہ خوفِ عقبیٰ، یہ خوفِ موجود و غیر موجود
یہ لمحہ لمحہ نئی مصیبت، یہ ہر قدم پر نئے جہنم
یہ گیلی لکڑی کی طرح کب سے سلگ رہا ہے وجودِ آدم
فضا کی معصوم سادگی پر دھوئیں کے بادل ہیں چھائے کب سے
دھوئیں کے بادل میں ایسا پانی کہاں سے آئے گا جو برس کر
زمین کی آگ کو بجھا دے، زمین کو موت سے بچا لے

کہاں سے آئے گا ایسا پانی زمیں کے جھلسے ہوئے لبوں تک
ہزاروں صدیوں کی پیاس جو صرف لمحہ بھر کے لیے بجھا دے
دھوئیں کے بادل میں ایسا پانی نہیں، یہ کچھ لوگ جانتے ہیں
مگر یہ کہنے کی ان میں بھی اب سکت نہیں، حوصلہ نہیں ہے
(انھیں بھی اپنی بچی ہوئی کچھ مسرتوں کا خیال ہوگا)
دھوئیں کے بادل کو لوگ ساون کی کالی کالی گھٹا نہ سمجھیں
تو ــــ جیسا یہ سوچتے ہیں ــــ پینے پلانے میں کچھ مزہ نہیں ہے
"مزے" کی خاطر میں موت کے زیرِ سایہ زندہ نہ رہ سکوں گا
ذلیل تنکوں کی طرح امواجِ وقت پر میں نہ بہہ سکوں گا

(۲)

حقیقتوں سے فرار کرنے کا قصد میں نے کیا نہیں ہے
حقیقتوں سے فرار کرنے کا قصد آخر میں کیا کروں گا
ہوس نہیں ہے مجھے زمانے کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کی
اجل سے خائف نہیں ہوں، غم سے نیا نیا سابقہ نہیں ہے
مگر میں اس کش مکش کے دامِ بلا میں پھنس کر یہ سوچتا ہوں
کہ غم اٹھانے کا کوئی حاصل نہ ہو تو غم کوئی کیوں اٹھائے
کوئی مسرت کا خوں کرے کیوں، اگر یہ خوں رنگ ہی نہ لائے
حقیقتوں سے فرار کیسا، حقیقتوں کو میں ڈھونڈتا ہوں
میں جانتا ہوں مجھے مرے اضطراب نے کچھ دیا نہیں ہے
تو پھر میں بے وجہ آرزوئے سکوں کو کس طرح بھول جاؤں
میں جانتا ہوں یہ قید خانہ ہے اس کو منزل میں کیسے سمجھوں
مہیب خوابوں کے سلسلوں میں، حسین دھندلکوں میں گھوم پھر کر
زمانے بھر کے غموں کو اپنے کلیجے سے میں لگا لوں پھر بھی
مرے کلیجے کو کوئی ٹھنڈک نہ مل سکی ہے، نہ مل سکے گی
ہزار روؤں، ہزار آنسو بہاؤں لیکن یہ وہ جگہ ہے

جہاں نئی زندگی کی کوئی کلی کھلی ہے نہ کھل سکے گی
دھوئیں کے بادل فضاؤں میں زہر گھولتے جا رہے ہیں پیہم
یہاں تو دم گھٹ رہا ہے میرا ہے سانس لینا بھی مجھ کو دوبھر
یہ کش مکش وہ ہے جس نے بے وجہ میرے ماضی کا خوں کیا ہے
مجھے زمانے کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کی ہوس نہیں ہے
غموں سے خائف نہیں ہوں پھر میں حسیں دھندلکوں میں بند کیوں ہوں
غموں سے الجھا ہوا ہوں آخر مآل پر کیوں نظر نہ رکھوں

(۳)

طویل مدت کے بعد زندانِ تیرگی سے رہا ہوا ہوں
مری نگاہوں سے کوئی دیکھے جمالِ دوشیزۂ سحر کو
مری نگاہوں سے کوئی کیا دیکھ پائے گا میں ہی دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں بڑی محبت سے صحن گلشن میں نرم کرنیں
گلوں کی نظریں بچا کے شبنم کے وہ حسیں راز چن رہی ہیں
جو ساغرِ شب کے ٹوٹتے ہی ہر ایک جانب بکھر گئے تھے
یہ نرم کرنیں حسینۂ زندگی کا ملبوس بُن رہی ہیں
میں دیکھتا ہوں مری طرف کب سے دیکھتے ہیں یہ لالہ و گل
جنھیں کسی باغباں نے اب تک کبھی اشارہ کیا نہیں ہے
جنھیں کسی بوالہوس کی نظروں نے دور سے بھی چھوا نہیں ہے

یہ سبز و شاداب کنج کے خواب زار سے کون جھانکتا ہے
یہ کس کی نظریں اتر رہی ہیں دل و جگر میں قرار بن کر
یہ میری رگ رگ میں کس کی نظریں سما رہی ہیں خمار بن کر
یہ کس کے قدموں کی رس میں ڈوبی ہوئی سی آہٹ میں سن رہا ہوں
میں سن رہا ہوں وہ نغمۂ پاک جس کی لہریں اٹھی ہیں شاید
مہیب صدیوں کی خامشی کے سڑے جنازے کو دفن کر کے

مجھے یہ لہریں زمانے کی تلخ کشمکش سے نکالتی ہیں
مری تمنا کو اک نئی روح، اک نئے تن میں ڈھالتی ہیں
یہ میرا دامن ہے جس سے ماضی کے سارے ہی داغ دھل گئے ہیں
میں گرتے گرتے سنبھل گیا ہوں، میں آج کتنا بدل گیا ہوں
میں کتنی حیرت سے، کس مسرت سے دیکھتا ہوں کہ میرے آگے
یہ وسعتیں کس قدر حسیں ہیں، یہ وسعتیں جن کے دامنوں پر
نقوش پا کے نہ مٹنے والے سیاہ دھبے نہیں پڑے ہیں
یہ راستے سو گئے ہیں شاید کبھی مجھے بے نیاز پا کر
یہ راستے میرے راستے ہیں انھیں گلے سے لگا لوں جا کر
میں دیکھتا ہوں مرے لیے کتنی منزلیں ہیں کنواری بیٹھی
میں دیکھتا ہوں مرے لیے کتنے بند دروازے کھل گئے ہیں
ہوس نہیں ہے مجھے زمانے کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کی
غموں سے خائف نہیں ہوں ان وسعتوں میں بھٹکا کروں گا تنہا
بھلا مجھے زندگی کی معصومیت کا دیدار کیوں نہ ہوگا

ابن انشا

خزاں کی ایک شام

شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگ گئے
دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے

پت جھڑ! تو نے کس کس کو حیران کیا ہے؛
"باغ سے پھول اور پھول سے بھونرا چھین لیا ہے"

بھیڑیں بھوکی کھیتوں کے چکر کاٹ رہی ہیں؛
"مینڈوں سے اڑتی مٹی کو چاٹ رہی ہیں"

پچھوا تو نے اپنی سوندھی باس گنوائی
"آج سے میں نے اگلی رت کی آس گنوائی"

پودے تو کیوں سوکھ رہا ہے، زرد ہوا ہے
"اس جنگل میں جینے سے جی سرد ہوا ہے"

سپنوں کی پریوں کے آنچل چوم رہے ہیں
ہم بھی چپ چپ تنہا گھوم رہے ہیں

کیسے اُجڑی بستی کو آباد کرو گے
لوگو! کل تم ہم لوگوں کو یاد کرو گے

دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے
شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگے

اُفتاد

'کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے'

——— اختر الایمان

(۱)

نگاہوں کی دوری کی دشوار منزل میں تم آج سے دور تر ہو گئے ہو
شبِ ہجر کی اوّلیں منزلوں سے گریزاں مثالِ سحر ہو گئے ہو
تمھیں زیست کے موڑ پر آ کے ملنے کے وعدے کی میعاد تو آ چکی ہے
مگر اب تو کچھ پاؤں تھک سے چلے، دور کی بات ہے، شام دھندلا چکی ہے
وہ اُتر کے ملکوں سے کونجیں رو پہلی مسلسل چلی آ رہی ہیں
وہ پچھم سے اُمڈے اندھیرے کی پرچھائیاں سُرمئی پنکھ پھیلا رہی ہیں
وہ پورب میں ممیاتی بھیڑوں کے گلّے کے باڑے کے پہلو میں دہکا الاؤ
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے، ابھی لوٹ جاؤ

سبک چاند نے سرمئی شام کی بھاری چلمن کو سرکا کے چہرہ دکھایا
اداسی کے گرداب کے دائرے اور گہرے ہوئے جانے کیا یاد آیا
فضاؤں میں کچھ جانی پہچانی شکلیں ہیولوں کی صورت کہیں تیر آئیں
کسی نے ہر اک صبح ڈیوڑھی پہ آ کر گئی شب کی ناشاد خبریں سنائیں
بایں چاکِ داماں بھی کنعاں کے یوسف سندِ بے گناہی کی کیا کیا نہ لائے
مگر قلعۂ مصر کے اونچے بُرجوں کو زنہار زنہار جھکنا نہ آئے
یہ ہالی کے بیلوں کی جوڑی کے گھنگھرو جھنا جھن جھنا جھن بجے جا رہے ہیں
کہ یادوں کی ویران راہوں سے پھر دوستوں کے وہی قافلے آ رہے ہیں

شبِ ماہ میں گھومتے گھماتے شعر سنتے سناتے سحر کرنے والے
وہ سرمست و آوارہ احباب اپنے، وہ سپنوں کے لوبھی امنگوں کے پالے
کسی ساحلِ بحرِ زخّار کی سیپیاں چنتے چنتے کہاں کھو گئے ہیں
کہ اُن کی جبینوں کے روشن چراغوں کی یادوں کے شعلے بھی مدھم ہوئے ہیں
ارے اونچے اونچے حریموں کے اوپر سے پرواز کرتے پرندوں کی ڈارو
سنو تو سہی کوئی دم کو ہمیں ساتھ لے جاؤ ان دوستوں میں اتارو
مگر گاؤں کے جھونپڑوں کا دھواں جس میں رنگِ شفق تھوڑا تھوڑا سمویا ہے
نگاہوں کی دوری کے پردے کی مانند دیوار محکم بنا جا رہا ہے

(۲)

مرے دل کے روشن جھروکے سے جھانکا ہے پھر ایک معصوم و شاداب چہرا
تصور مجھے تیرے بھرپور جلووں کا خاموش پیغام دیتا رہے گا
اسے اپنی وحشت کی افتاد سمجھیں کہ پندارِ مجبور کی بے نیازی
بہت دن بساطِ جہاں پر رہے پر یہ نردیں نہ چھوئیں، یہ کھیلی نہ بازی
رفیقوں نے اپنے مصافِ جہاں میں ولایات جیتی ہیں، میدان مارے
مگر ہم تو ان سے بچھڑ کے لڑائی کے پہلے ہی میدان میں اپنے سے ہارے
کوئی آشنا آشنا سی خلش پھر بھی مجبور کرتی ہے بولو نہ بولو
کہیں سے بلاوے دوست آنے لگی ہے ذرا من کی ڈیوڑھی کی کنڈی تو کھولو

بہت دور کی بات ہے سرد راتوں میں اندھے چراغوں کے سایوں میں لپٹے
کتابوں کے قصّوں کے جنّوں سے دنیا زمانے کے اسرار پوچھے تھے ہم نے
سنا تھا ہماری ہی رہ تک رہی ہیں تجسّس کی پریاں سر اپنے سنوارے
مگر کوئی اپنے بلاوے نہ بولے، بہت نام لے لے کے ہم تو پکارے
کبھی خضرِ فرخندہ صورت نے ہم کو نہ زنبیل بخشی نہ جادو سکھایا
ہمیں تو زمانے کے کوہِ ندا سے یہی ایک پیغام سننے میں آیا
نہ سینے سے آہوں کے بادل اٹھاؤ، نہ آنکھوں سے اشکوں کے خوشے اگاؤ

جو محنت کرو اُس کی اُجرت بھی مانگو جو کھیتی کو جوتا ہے رزق بھی کھاؤ

مگر آنے والے زمانے کے مرلنؔ[1] جو آئے تو اسمِ کرامات آئے
پرانے صحیفوں کے احکامِ عشرہ کو منسوخ کرتے نئے حکم لائے
کتابوں کے پیچیدہ لفظوں کا جادو بھی دھرتی کے بیٹوں کے سر چڑھ کے بولا
نئے ہادیوں نے نئے منبروں سے نئے آدمی پر نیا بھید کھولا
سرِ طاق، برجِ چہارم کے اوپر، دبیرِ ازل کے نوشتے دھرے ہیں
کہ جن میں بشر کے مقدر کے ابواب و اوراق تک مرتسم ہو چکے ہیں
جو چھوٹا ہے تحقیق چھوٹا رہے گا بڑے ہی کے مقسوم میں ہے بڑائی
یہ کاذب ہے باغی، ابد تک فنا ہی، یہ مزدک ہے کافر، یہ لینن قصائی

(۳)

اجالے کے خلاق سورج کی زرتار تاروں سے یا کہکشاں کی چھوٹی ہے
تو پھر آج کی شام کیوں آنے والے سویرے کے عدوں کو بھولی ہوئی ہے
اجالے اندھیرے کے طناز تاگے طلسمات کیا کیا بُنے جا رہے ہیں
نئے بندی خانوں کی باڑوں کے کانٹوں میں وحشی خیالوں کو چنتے رہے ہیں
یونہی شب کے پچھلے پہر کے مسافر، بہر گام تازہ غزل گانے والے
سلاسل کے لوہے کی سنگیں صلابت کو شمعِ شبستاں پہ پگھلانے والے
زمانے نے گیلی[2] غلاموں سے اب تک ہزاروں برس فاصلہ طے کیا ہے
ہر اک گام پر یہ مسافر نے دیکھا کوئی بیسٹل[3] راہ روکے کھڑا ہے
زمیں زادگاں پر زمیں زادگاں نے کبھی تیر چھوڑا، کبھی دام پھینکا
کبھی شہر و قریہ کو بلسن[4] بنایا، کبھی کشت و گلشن پہ نیپام پھینکا

---

[1] کنگ آرتھر کے دربار کا جادوگر جس کا کردار ولن کا کردار ہے۔ [2] Galley Slaves
[3] Bastill فرانس کا مشہور قید خانہ جو انقلاب فرانس میں ٹوٹا۔
[4] نازیوں کا مشہور بندی کیمپ۔

کبھی اپنے طرار ہمسار بھیجے، کبھی اپنی جرار فوجیں بڑھائیں
کبھی ٹینک دندنیک چڑھ آئے ظالم مگر ایسے حق بات کہتی ہے سائیں؛
کسی نے کہا اب اڑان چھتریوں سے قلم کے حیالے سپاہی اتارو
چلو چل کے مطلب کے میدان دیکھو، چلو کچے ذہنوں پہ شبخون مارو
فسانے بنو، یہ نیا آدمی غاصبوں کے بے کھل کھیلنے کا بہانا
کسی نے بہائم کے باڑے کا باسی[1]، کسی نے خداوندِ ناکام[2] جانا

نیا آدمی بوڑھے آدم کا بیٹا کہاں تک بھلا خود کو حیران کرتا
سرِ بامِ چرخِ چہارم بھی پہنچا، سرِ بالِ جبریل طیران کرتا
اسیرِ ازل نے دبیرِ ازل کے نوشتوں کی محفوظ تحریر بدلی
یہ بےباک و گستاخ و کافر تو ٹھہرا مگر ارضِ اسفل کی تقدیر بدلی
کبھی ہمآہنگ ہو کے غرورِ شاں پہاڑوں کے تسخیر کرنے کو پشتے بنائے
کبھی آمو دریا کی پہنائی چیرے تو دشتوں کو فصلوں کے مژدے سنائے
ملوں کی مشینوں کے جائے یہ مزدور، دھرتی کے کھیتوں کے بیٹے یہ ہالی
ہوئے تاشقند و بخارا کے سلطاں بنے کینٹن اور کنٹن کے والی

(۴)

ہمیں بھی ہوس تھی کہ آورش کے محل ایسے بنائیں کہ ڈھائے نہ جائیں
سرِ عشق میں بےستوں کوئی کاٹیں، جنوں کو کسی نجد میں آزمائیں
کسی بحر میں لے کے نکلیں سفینہ تو پہنائے پاتال تک گھوم آئیں
وہ ہیروں کی وادی وہ مونگوں کے ٹاپو کہاں ہیں چلو ہمتیں آزمائیں
جو کنگال ہیں ان کو دھرتی کی دولت عنایت کریں مسندوں پر بٹھائیں
جو مزدور ہیں ان کو محنت کا حاصل جو دہقاں ہیں ان کو کھیتی دلائیں
جو ناکام ہوں تو غزلخواں غزلخواں بڑھیں بہرِ پاداش بےخوف ہو کر

---

[1] جارج آرویل کی اینمل فارم [2] کراسمین کی مرتبہ "گاڈ دیٹ فیلڈ"

مریں تو مریں مثلِ جبریل پیری، جئیں تو جہاں میں دست‌ِ رُوفت ہو کر

مگر دوستو، دوستو، دوستو! ہم جہاں سے چلے تھے ابھی تک وہیں ہیں
وہ آدرش کے محل تو ڈھا چکے، ان کے کھنڈرات میں غول بن کے مکیں ہیں
وہ پہلے سا وحشت کا عالم کہاں ہے، ابھی سے یہ محسوس ہونے لگا ہے
افق سے افق تک بڑی منزلیں ہیں، کراں سے کراں تک بڑا فاصلہ ہے
بہت جی میں آتی ہے یاروں سے کہہ دیں، ہمیں بھی پکارو، ہمیں بھی بلاؤ
مگر سالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے، ابھی لوٹ جاؤ
گدائی میں ہم شہرِ کنعاں کے سنگیوں کے محلوں کے دیوار و در چوم آئے
جو سچ پوچھو اس میں بڑی عافیت ہے مگر قلعۂ مصر کو کون ڈھائے

ہمیں گردِ بن کر پسِ کارواں دھندلے دھندلے سے قدموں پہ چھٹتے رہیں گے
ہمیں راستے کے ہر اک موڑ پر اک نہ اک عذر پر یوں ہی تھکتے رہیں گے
مگر دور کی منزلوں کی یہ راہیں تو ویران اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
جری شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے انجان اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
سمجھتے ہیں ہم آنے والا زمانہ تمھارا ہے لوگو ہمارا نہیں ہے
مگر اپنے پاؤں کر تھک سے گئے، ان میں اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں ہے
یہی راستہ ہے رُکے تو گئے —— رات لمبی ہو یا باٹ لمبی ہو جاؤ
وہ پورب میں ممیاتی بھیڑوں کے گلے کے باڑے کے پہلو میں دہکا الاؤ

مصطفیٰ زیدی

کاروبار

دماغ شل ہے، دل ایک اک آرزو کا مدفن بنا ہوا ہے
اک ایسا مندر جو کب سے چمگادڑوں کا مسکن بنا ہوا ہے
نشیب میں جیسے بارشوں کا کھڑا ہوا بے کنار پانی
بغیر مقصد کی بحث، اخلاقیات کی بے اثر کہانی
سحر سے بے زار، رات سے بے نیاز، لمحات سے گریزاں
نہ فکرِ فردا، نہ حال و ماضی، نہ صبحِ خنداں، نہ شامِ گریاں

پکارتا ہے کوئی تو کہتا ہوں، اس کو سن کر بھی کیا کرو گے
اُدھر گزر کر بھی کیا ملے گا، اِدھر نہ جا کر بھی کیا کرو گے
شفق نظر کا فریب ہے، تتلیوں کی رنگت میں کچھ نہیں ہے
فراق میں کیا طلسم ہوگا جب اس کی قربت میں کچھ نہیں ہے
لہو کی گرمی ہے کمسنی کی دلیل، اس سے نجات پاؤ
یہ نظم تکمیل پا کے بھی کیا کرے گی، دفتر کے کیس لاؤ

عدالت

غرورِ قدرت کی مسند سے اور عظمت کے پیکر
زمیں کے چہرے پہ جھک گئی ہے
زمیں کی دخترِ سعید اپنے آنسوؤں اور ہچکیوں میں
شفیق، ہمدرد باپ کی بارگاہ کا ایک ستون تھا جو
گناہ کا اقرار کر رہی ہے

ترے فرشتے
ترے فرشتے کہ جن کی قسمت میں محض تسبیح و نے نوازی
نہ سوزِ فطرت، نہ دلنوازی
یہ وہ ہیں جن کے شریر اور بدمزاج بچوں
نے آسماں کے کئی ستاروں کو توڑ کر
اپنے ہاتھ میں خون کر دیا ہے
یہ وہ ہیں جن کی غلام روحوں
نے صبح کے دیوتا کا مندر
سفید برفانی چوٹیوں کی بلندیوں سے ہٹا دیا ہے
اگر یہی ہے گناہ کہ جب
دیوتا کے پاؤں پہ وہ بیدرد ٹھوکروں کی کثرت
سے آبلے پھوٹنے لگے تھے
تو ایک معصوم بھولی بھالی حسین لڑکی نے اپنے گھر

اُسے بلایا تھا، اُس کے زخموں کو دھو کے مرہم لگا دیا تھا
اسے محبت کی نرم، پاکیزہ لوریوں میں سلا دیا تھا

تو اے خدایا
تری کنواری، سفید لڑکی
گناہ کا اعتراف کر کے
سزا کی حقدار ہو گئی ہے

بے سمتی

گیئر بدلتے ہوئے منھ سے پھینک کر سگرٹ
ڈرائیور نے ٹریفک کو ماں کی گالی دی
کہاں حضور، کہاں کیڈلک، کہاں بیجو

کہاں حکایتِ شیریں دہاں و شہد لباں
کہ ایک سیر شکر کا نہ مل سکا پرمٹ
کہ دفتروں کو چلاتے ہیں تلخ گو بابو

گمان بن گئی تہذیبِ رستم و سہراب
حکومتوں نے بحقِ خزانہ ضبط کیے
رموزِ کیسۂ مازندران و کیخسرو

تمام دستخطی فائلوں میں ڈوب گئیں
پری رخانِ عجم کی جھجکی جھجکی پلکیں
طلسمِ ہوش ربا کا گھنا گھنا جادو

کہاں مسائلِ روحانیت، کہاں وجدان
مکان، قلتِ اسباب، کثرتِ اولاد
شکار، بینک، برج، ریس کورس کی تگ و دو

نہ جانے حسن نے کس غم میں خودکشی کر لی
یہ رات ہم پہ گزرتی تو ایک بات بھی تھی
مگر یہ سانحۂ مرگ میرلن منرو

یہ تھوڑی دور پہ دوکانیں ناشتاؤں کی
لبوں پہ آخرِ شب کی بجھی ہوئی بیڑی
بدن میں تلخیٔ شہوت سے تارکول کی بو

شعورِ تیرگی کی حدیں نہیں ملتیں
اب ان کو صورِ سرافیل کیا جگا سکے گا
جگا چکا جنھیں مل میں بجتا ہوا بھونپو

ہر ایک شب مری محبوبہ مجھ سے ملتی ہے
لبوں پہ سحر کناں میکس فیکٹر کی ہنسی
نسن کا حسنِ نظر ، ریولان کے ابرو

گلی میں پان کی دوکان ، ریڈیو پہ ہجوم
حنیف دیکھیے کب سنچری بناتا ہے
فضل کی گیند کے آگے نہ جم سکے ہندو

جہاز اُڑ گئے بمباریوں کے عزم کے ساتھ
کہیں سے دل کی صدا آئی اس طرح جیسے
فلیپ کے بلب سے آگے چراغ کے آنسو

سنو یہ منتشر ہوا اعصاب مرتب اشتیاق

کسی کا خون پیا بربریت کی وحشت نے
کسی نے پی لیا بدلے میں بربریت کا لہو

تمام مشرقِ وسطیٰ کا ایک پیکر ہے
ہر اک درخت میں آبِ حیات نکہت [illegible]
ہر ایک فصل میں واشگفتگی کا جوشِ نمو

کہیں سے آئی صدا علم سب سے برتر ہے
کہیں سے آئی صدا عشق سب سے برتر ہے
کہیں سے آئی صدا لا الٰہ الا ہو ۔ ---

رہِ نجات نہ آوارگی نہ [illegible]
علاجِ تیرگی ہے [illegible] نہ عقل نہ عشق
نہ ملحدوں کے پیالے، نہ صوفیوں کے کدو

وہی تفکر کی یہ واماندگی، یہ بے سمتی
مبصرو! کوئی تعبیر پر تفلسف لاؤ
یہ چاک سوزنِ مذہب سے بھی ہوا نہ رفو

وزیر آغا

اُجڑتا شہر

سیہ رو قلندر
عجب بے نیازی سے لوہے کا چمٹا بجائے

کبھی کوئی تانگے کا گھوڑا، دہکتے ہوئے تیز چابک سے ڈر کر
کسی گرم چکنی سڑک پر ذرا لڑکھڑائے
تو اک نقرئی قہقہہ چیخ میں ڈوب جائے

کبھی چہچہاتے ہوئے ننھے بچوں کی ٹولی
پرانی سی اک بس کے پنجرے سے نکلے
گلی کے کھلے منہ میں چپکے سے اُترے
اُدھڑتی ہوئی اک عمارت کے اندر پہنچ کر معاً ٹوٹ جائے

کبھی کوئی ریلا لُڑھکتی ہوئی سائکلوں کا
کسی کالے دھبے سی منزل کو بڑھتا ہی جائے
کبھی تیز رفتار موٹر کے یکدم ٹھہرنے
بریکوں کی اک کرب انگیز سی چیخ کے لاکھوں ٹکڑوں
میں بٹنے کی آواز آئے
کبھی چوک کی ایک صدیوں پرانی، نم آلود کھڑکی
کی چوکھٹ پہ ٹھوڑی ٹکائے

کوئی زرد چہرہ پھٹی سُرخ آنکھوں کے زندان میں
بے قراری سے پھرتی ہوئی پتلیوں کا تماشا دکھائے
تماشا گر کون دیکھے ؟
کبھی تم جو دیکھو تو ان پتلیوں کے سمندر میں
اس ٹوٹے پھوٹے ہوئے آئینے میں
تمھیں اپنی بکھری ہوئی ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا
اک ہیولیٰ اُبھر کر بلائے
اجڑتے ہوئے شہر کا ایک منظر دکھائے

کوہِ ندا

صبح سویرے
ایک لرزتی کانپتی سی آواز آتی ہے
سونے والو! تم ہانک کو بھول گئے ہو
تم ہانک کو بھول گئے ہو
پھر چمکیلی ٹل کا سناٹا
ایک تھکیلا ڈرانے والی تند صدا کے روپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں کے
تنگ اندھیرے باڑے میں کہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلے کو ہانک کے لے جاتا ہے
پھر انجن کی برہم سیٹی
چیخ سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے
اور شب بھر کی تھکی ہوئی اک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے
پھر اک دم اک سناٹا سا چھا جاتا ہے
اور میں گھڑی کی ظالم سوئیوں کی ٹک ٹک میں
دن کے زرد پہاڑ پہ چڑھنے لگتا ہوں

درماندہ

رس بھرا لمحہ
زمانے کی کٹھن ڈالی سے ٹوٹ کر
آج میرے تن کے رس امرت میں گھل کر
ایک پل کو نہال ہوا

رس بھرا لمحہ
سمے کی شاخ سے ٹوٹا
مری پھیلی ہوئی جھولی میں گر کر
آج میرا ہو گیا

یک بیک
قرنوں کے ٹھہرے کارواں نے پھر جھرجھری لی — چل پڑا
رس بھرے لمحوں کا محمل
اونٹنی کی پشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا :
تو رہ گیا !

منیر نیازی

سائے

کسی سائے کا نقش گہرا نہیں ہے
ہر اک سایہ اک آنکھ ہے
جس میں عشرت کدوں ، نارسا خواہشوں
ان کہی دلنشیں داستانوں کا میلہ لگا ہے
مگر آنکھ کا سحر، پلکوں کی چلمن کی ہلکی سی جنبش ہے
اور کچھ نہیں ہے
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے

ہر اک سایہ
چلتی ہوا کا پُراسرار جھونکا ہے
جو دور کی بات ہے
دل کو بے چین کر کے چلا جائے گا
ہر کوئی جانتا ہے
ہواؤں کی باتیں کبھی دیر تک رہنے والی نہیں ہیں
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے
کسی سائے کا نقش گہرا نہیں ہے

دیکھنے والے کی اُلجھن

سورج میں جو چہرے دیکھے
اب ہیں سپنے سمان
اور شعاعوں میں اُلجھی سی
گیلے گیلے ہونٹوں کی وہ نئی لال مسکان
جیسے کبھی نہ زندہ تھے یہ
چھوٹی چھوٹی اینٹوں والے کھنڈرے برت مکان
کہاں گئی وہ شام ڈھلے کی
سرسر کرتی تیز ہوا کی دل پر کھنچی کمان
اور سپنا جو نیند میں لایا
پوری ادھوری، خواہشوں کا
اک درد بھرا طوفان
کوئی کیسے کرسکتا ہے ان سب میں پہچان

میرے دشمن کی موت

تیغ لہو میں ڈوبی تھی اور پیڑ خوشی سے جھوما تھا
بادِ بہاری چلی جھوم کے جب اس نے مجھ کو دیکھا تھا
گھائل نظریں اس دشمن کی ایسے مجھ کو تکتی تھیں
جیسے انہونی کوئی دیکھی ان کمزور نگاہوں نے
یہ انصاف تو بعد میں ہوگا کیا سچ کیا جھوٹا ہے
کون یقیں سے کہہ سکتا ہے کون برا کون اچھا ہے
لیکن پھر بھی ایک بار تو میرا دل بھی کانپا تھا
کاش یہ سب کچھ کبھی نہ ہوتا میں نے دکھ سے سوچا تھا
گھائل نظریں اس دشمن کی گہری سوچ میں کھوئی تھیں
جیسے انہونی کوئی دیکھی ان کمزور نگاہوں نے
کون ہوں میں اور کون تھا وہ جس پر ہونی نے وار کیا
کون تھا وہ جس شخص کو میں نے بھری بہار میں مار دیا

بلراج کومل

کاغذ کی ناؤ

رات کو سونے سے پہلے
مجھ سے ننھا کہہ رہا تھا: چاند لاکھوں میل کیونکر دور ہے
کیوں چمکتے ہیں ستارے؟ .... دو غبارے ... کالی بلی کیا ہوئی؟
میرے ہاتھی کو پلاؤ گرم پانی .... وہ کہانی .... مجھ کو نیند آنے لگی

نصف شب کو آتے جاتے بادلوں کے درمیاں
کچھ حروفِ ناتواں
بوندیوں کے روپ میں کاغذ کے اک پرزے پہ میرے سامنے
دیر تک گرتے رہے
نظم کے نقشِ گریزاں نے ستم لاکھوں سہے
ان گنت برسوں پہ پھیلی چشم و دل کی داستاں
رات کے پچھلے پہر کی گود میں
تیز تر ہوتی ہوئی بارش کی لوری سن کے شاید سو گئی

صبح دم
کھل اٹھے چاروں طرف بچوں کے رنگیں قہقہوں اور تالیوں کے شوخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگاتی، ڈولتی،
چل رہی تھیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں
میں نے دیکھا ان میں ننھے کی بھی تھی پیاری سی ناؤ
نظم کا نقشِ گریزاں، جانا پہچانا سا کاغذ، جانے پہچانے حروف
ننھا بولا: آج جو تالی نہ پیٹے بے وقوف!

ایمبولنس

جو مجھ کو لائی تھی سکون گاہ میں
وہ ایک تھی
سپید، صرف ایک، اس کے پہلوؤں، جبیں اور پُشت پر
صلیب کے نشان تھے

بس چور چور اک عظیم گھاؤ تھا
وہ مجھ کو دستِ مہرباں میں سونپ کر
چلی گئی تو میں غنودگی کی بے کراں مہیب دُھند میں بھٹک گیا
ہر ایک رہگذر پہ گاڑیوں، بسوں کا کارواں امنڈ پڑا
عجیب انقلاب تھا مری نظر کے سامنے
وہ ایک پل میں سب سپید ہو گئیں
سپید سب سپید، ان کے پہلوؤں، جبیں اور پُشت پر
صلیب کے نشان دفعتاً اُبھر کے آگئے

الم نصیب، ان کے بے اماں مکیں
مرے ہی ہم نفس، وفا شعار وہ عزیز تھے
جو سادگی سے کوئی مشتہر فریب کھا گئے
کسی مہیب جنگ، بھوک، قحط یا وبا کی زد میں آگئے

پرندہ

پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اُس پار جاتا ہے
پرندہ بال و پر ہے، آنکھ ہے لیکن —
سنہری چونچ سے پرواز کرتا ہے
سڑک پر دھوپ ہے اور دھوپ میں سایوں کے ناخن ہیں
گھروں میں خول ہیں اور آنگنوں میں خار اُگتے ہیں
کسی کا کون ہے؟ کوئی نہیں، سب اجنبی ہیں حیرت و حسرت میں زندہ ہیں

وہ عورت ہے
وہ خواہش کے لپکتے خنجروں سے پیار کرتی ہے
وہ اس کا ہم سفر ہے، خاک و خوں اس کا مقدر ہے
یہ موجِ آب ہے، اب پھول ہے، اب پیڑ ہے، کل صرف پتّہ ہے
اگر یہ زندگی کرنے کی کوشش میں پریشاں ہیں
یہ اکثر قتل کرتے ہیں
یہ اکثر قتل کرتے ہیں
لہو کے پار گلشن ہے، مگر گلشن لہو میں ہے
نگاہوں میں اجڑتے شہر کی مانند تصویروں کا میلہ ہے
ہجومِ سنگ و آہن ہیں
کوئی آواز دیتا ہے، کوئی آواز سنتا ہے
مگر آواز سے آواز کا رشتہ نہیں ہوتا
مگر آواز سے آواز کا ہر سلسلہ بے کار ہوتا ہے

یہ منظر تیرتا ہے آبجو میں ہاسے لیکن اجنبی کیوں ہے ؟
میں منظر ہوں، تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں ؟
یہ فرشِ آب و گل میرے لیے اک سلسلہ کیوں ہے
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اُس پار جاتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے ؟
پرندہ ماورا کیوں ہے ؟

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا

مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دُور تک ——
بس خلا ہی خلا ہے

لمحے کی موت

کچھ دور تلک،
کچھ دور تلک —،
وہ لمحہ اُس کے ساتھ چلا
جب اُس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں، یہ دھواں
یہ کالی چھتیں، یہ اندھے دیے
سنولائے ہوئے سارے چہرے
اب اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے

جب نگر نگر کی سیاحی
اِن ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی آوارہ گردی
ہنستے جسم، کھنکتے پیالوں کی موسیقی
اس کو راس نہ آئی
اُس نے کہا : اب آؤ لوٹ چلیں
اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اُس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اُس کے بچپن کے
سب کہنے لگے
ان جگمگ کرتے شہروں کا

کچھ حال بتاؤ
اپنے سفر کی کچھ روداد کہو
وہ خاموش رہا
وہ دیکھ رہا تھا
اُس نیلے سے طاق کو
جس پر ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی

حمایت علی شاعر

تضاد

میں سوچتا ہوں
میں ایک انسان ہوں، ایک مشتِ غبار ہوں میں
ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
کہ ایک آواز سرسرائی فضا کی خاموش وسعتوں میں
پلٹ کے دیکھا
کوئی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا
جو لمحہ لمحہ بلندیوں کی طرف رواں تھا
میں اس کو تکتا رہا مسلسل
نہ جانے کب تک

نہ جانے اس لمحۂ گریزاں کے تنگ دامن میں کتنی صدیاں سمٹ گئی تھیں
نہ جانے میری نظر میں کتنے نئے اُفق جگمگائے
کتنے ہی چاند سورج ابھر کے ڈوبے
نہ جانے وہ کون سا جہاں تھا
زمیں، کہ پاؤں تلے کوئی فرشِ زر ہو جیسے
فلک، کہ سر پر ردائے آبِ گہر ہو جیسے
فضا منوّر ــــ
ہوا معطّر ــــ
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہتِ گلِ تر

خلاؤں میں مشتری و زہرہ کا رقص جاری
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرود طاری
نہ جانے میں کس خیال میں گم
کس ابر پارے پہ اڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا
کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اٹھا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا — ایک روٹی
خدا تمہارا بھلا کرے گا۔"

شاذ تمکنت

رت جگا

اندھیری رات، ہوا تیز، برشگال کا شور
کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی
ان آندھیوں میں کفِ دست کا سہارا کیا

کہاں چلے گئے تم سونپ کر یہ دولتِ نور
مری حیات تو جگنو کی روشنی میں کٹی
نہ آفتاب سے نسبت، نہ ماہتاب رفیق

جنم جنم کی سیاہی، برس برس کی یہ رات
قدم قدم کا اندھیرا، نفس نفس کی یہ رات
تمھاری نکہتِ برباد کو ترستی ہے

اب آؤ آکے امانت سنبھال لو اپنی
تمام عمر کا یہ رت جگا تمام ہوا
میں تھک گیا ہوں، مجھے نیند آئی جاتی ہے

سر و ساماں

پتھر کے بازارِ سیہ میں
شیشے کا سوداگر ہوں

میرا اثاثہ، میری دولت
آنکھوں کا نمناک تبسّم
ماتھے کی کاواک لکیریں
سانسوں کی ننھی سی دعائیں
ذہن کی جودت، دل کی شرافت
جینے کی اپنی سی لگن میں
زہر بھی امرت، غم بھی مسرّت
یوں رکھتا ہوں اپنے ہنر کو
جیسے گانے والا گداگر
نانِ شبینہ کی حسرت میں
سو پردوں میں زخم چھپا کر
اپنا ساز جتن سے رکھّے

زخمی دریچے

پھر وہی نیم شبی، پھر وہی آغازِ خلش
اب مگر بارِ طرب غم سے کہاں اٹھتا ہے
طاقِ دل دیکھ پسِ گرمیٔ بزمِ خوباں
کیسے پگھلی ہوئی شمعوں سے دھواں اٹھتا ہے

کس نے دیکھا ہے مرے پچھلے پہر کا ہنگام
کون جانے مرے مہتاب پہ کیا گزری ہے
میرے تاروں پہ سرِ چرخِ الم کیا بیتی
میرے بام و در و محراب پہ کیا گزری ہے
میری ٹوٹی ہوئی نیندیں، مرے بکھرے ہوئے خواب
میری راتوں کا مقدر، مری صبحوں کا عذاب

رات خاموش، فلک گُنگ، ستارے چپ چاپ
صحن خوابیدہ، شجر سرد، ہوائیں مبہوت
آنکھ نمناک، نظر چور، نظارے چپ چاپ
آہِ دل اذنِ بقا مانگ رہی ہو جیسے
میری تنہائی دعا مانگ رہی ہو جیسے

سرِ دیوار لچکتی ہوئی بیلیں چُپ ہیں
مدتیں بیت گئیں گل ہوئے پھولوں کے چراغ
میری راتوں کو میسر تھے رسولوں کے چراغ

روز ٹوٹے ہوئے پتّوں کی صدا آتی ہے
روز آنگن کی زمیں جیسے دہک جاتی ہے
ٹوٹے پتّوں کو سرِ شاخ سجانے کی لگن
اپنے روٹھے ہوئے پیڑوں کو منانے کی لگن
جانے کیا وہم ہے دے اٹھتا ہے لو ہر بُنِ مو
میری گردن پہ نہ ہو برگِ چکیدہ کا لہو

سخت ہے مجھ پہ تقاضائے شب و روزِ جنوں
قرض ہے مہر کی کرنوں کا مری صبحوں پر
میرے دامن پہ جھلکتا ہے شبِ ماہ کا خوں

سوچتا ہوں کہ کہیں زہر نہ دے بادۂ صبح
ہر شبِ غم کی نگاہوں میں ہے اندیشۂ صبح
کورے مٹی کے پیالے کی طرح نیل گگن
رات کے چاک سے جس وقت نکل آئے گا
پارۂ برف طلا فام کے مانند قمر
جب شفق رنگ جزیروں میں پگھل جائے گا
شست باندھے ہوئے سورج کی کرن آئے گی
پھر سے ہو جائیں گے دروازوں کے شیشے زخمی
میرا کمرہ، مرے کمرے کے دریچے زخمی

وحید اختر

سنگ سار

لوگ لائے اُسے حضورِ یسوع
اُس پہ الزام معصیت کاری
روح اُس کی گناہ آلودہ
اُس پہ کی زاہدوں نے حدجاری
مفتیِ وقت ظلم کا خوگر
سنگ انداز رحم سے عاری
دل تہِ دلق عدل ناآموز
زہد مغرور روحِ قہاری
رشتۂ اقتدار و زر کے اسیر
جبلِ دینِ متیں کے زناری
وہ دلِ درد آشنائے مسیح
یوں ہوا مانعِ ستم گاری
"پہلا پتھر وہی اٹھائے گا
بے گنہ جس کی عمر ہو ساری"

اے ابنِ مریم اے خدا کے رسول
اب بھی تیری زمیں ہے عصیاں کار
اب بھی الزامِ بے گناہی میں
سادہ دل ہو رہے ہیں سنگ شکار

تیرے مصلوب جسم کی سوگند
آج بھی مفتیانِ مکر شعار
کل کے چہرے پہ غازۂ تقدیس
باندھ کر عصمتِ نظر کے حصار
رُخ پہ ڈالے ہوئے نقابِ ریا
روح کے آئینے میں گرد و غبار
بصد اندازِ شانِ قدوسی
باہزاراں ادائے عزّ و وقار
لیے آنکھوں میں مریمی انداز
بھرے دامن میں سنگ کے انبار
قتل کرتے ہیں بے گناہوں کو
رخصتِ دم زدن نہیں زنہار
آنکھ کو اذنِ دید، لب پر مُہر
جائے عبرت ہے یا اولی الابصار

اہرمن ہے لباسِ یزداں میں
خوں ہے زینتِ صلیب و دار
اونچی دُکاں ہے منبر و محراب
اور ایماں ہے سود کا بیوپار
معرفت کی شرابِ خانہ کشید
ساغرِ جمؔ امام کی دستار
قایدِ ملت و مجاہدِ قوم
خانہ زادانِ دولتِ سرکار
جو بکے وہ عزیزِ مصر بنے
ہائے کیا شے ہے مصر کا بازار

بے خبر اپنے چاکِ دامن سے
عصمتِ یوسفی کے دعوے دار
چشمِ خفاش کر رہی ہے فاش
روشنی کے ڈھکے چھپے اسرار

اے رسولِ خدائے عزّ و جل
عبدِ معبود، عادل و ستّار
شرم رکھ لیتا ہے گناہوں کی
تیرا ربّ عیب پوش و پردہ دار
عدل کی شرط کیا ہے، بتلا دے
کیا ہے تعزیر کا طریقِ کار
عیب بیں، جُرم کوش، اہلِ ریا
کر رہے ہیں سزا جزا کا شمار
فیصلہ حق کا کر رہی ہے ہوس
دل ہے اپنی شکستگی کا مزار
راز اس مصلحت کا سمجھا دے
تا نہ شک میں رہیں صِغار و کبار
صاحبِ مسندِ قضا کیوں ہیں
مقتلوں مشہدوں کے پہرے دار

بندِ نقاب

شہر انسانوں کے چہروں کا اُمڈتا سیلاب
ہاتھ بڑھتے ہیں، نظر ملتی ہے، لب ہلتے ہیں
دل اس انداز سے چپ چاپ تکا کرتا ہے
جس طرح خواب میں کچھ لوگ ملیں آپس میں
واہمہ طرزِ نظر، بات کا انداز فریب
ملنا پرچھائیں کا پرچھائیں سے کچھ بات نہیں
روح پہنے ہوئے پھرتی ہے سراپا کا لباس
خود تو مجبورۂ نادیدہ ہے، چہرے ہیں نقاب
جن میں احساس نہ جذبات نہ افکار نہ جاں
کاغذی پیرہنوں ہی سے ہے آباد جہاں

آئینہ خانۂ صد جلوۂ انسانی میں
آنکھ ہے حیرتیِ آئینۂ خود بینی
سب ہی زندانِ طلسماتِ انا میں ہیں اسیر
در و دیوار کا نادیدہ و ساکت پتھراؤ
مستقل چلتا ہے بے آتش و دود ایک الاؤ
روح خاموش سلگتی ہے، چٹختے ہیں دماغ
اور اس آگ کا ظاہر میں نہیں کوئی سُراغ

کون جانے کہ نقاب اُٹھے تو کیا صورت ہو
اسی اندیشے سے ہیں منہ کو چھپائے ہوئے لوگ

قفسِ رنگ میں جی کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں
زندگی بستۂ و تاریک گپھاؤں کا قیام
عمر تنہائی میں کاٹا ہوا اک حبسِ دوام

کھنڈر، آسیب اور پھول

یہ بھی طلسم ہوشربا ہے
زندہ چلتے پھرتے، ہنستے روتے، نفرت اور محبت کرتے انساں
صرف ہیولے اور دھوئیں کے مرغولے ہیں

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے توہم کے کاندھوں پر لادے سست قدم واماندہ
خاک بہ سر، داماں دریدہ، زخمی پیروں سے کانٹوں انگاروں پر چلتے رہتے ہیں
ہم سب ایک بڑے قبرستاں کے آوارہ بھوت ہیں
جن کے جسم تو ہاتھ لگانے سے تحلیل خلا میں ہوں
جن کی حدوں کا ظاہر سے ظاہر گوشہ ہاتھ نہ آئے

ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے
ڈھیر ملے ہیں

وہ روشن شب تاب دیے جن سے ماضی کو نور ملا تھا
اس آسیب زدہ ماحول میں یوں جلتے ہیں
جیسے اک پرہول بیاباں کے تیرہ سناٹے میں
کچھ بھوتوں نے
رہ گم کردہ سیاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو

اب یہ اُجالے صرف دھواں ہیں
اور آسیب زدہ کھنڈروں کی چھت کے چٹخے شہتیروں کے شور میں کوئی ہنستا ہے

بکھرتا چُنتا، گرتی جھتی، نیم معلق دیوار و در
پیچھے چھپ کے روتے ہیں
طاقوں سے خاموش دیے ظلمت کو شعلہ دیتے ہیں
صحن کے صد ہا سال پرانے بوڑھے پیڑ
قبروں کے بے درد مجاور بن کر لاشوں پر سوکھے پتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستاں کی پُر ہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں
منتظرِ مرگ، ایمہ ہم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سُو دیکھ رہا ہے
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے
جوتوں کا جلتا دیکھے گا
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں رو دیں گے

اس منظر میں جانے پھر ایسا کوئی آئے کہ نہ آئے
جو ویراں مایوس نگاہوں کی خالی جھولی پھیلائے
راکھ میں پھول کریدے گا

چراغِ تہہ داماں

تری رہگذر میں دھڑک اٹھا دلِ زار پھر
نہ کبھی ملے، نہ کبھی قرینے سے بات کی
غمِ کائنات کی اوٹ میں نہ بیاں ہوئیں
وہ ادھوری پوری کہانیاں غمِ ذات کی
کہ انھیں سنانے کا اور سننے کا حق نہ تھا

تری رہگذر میں چراغ میرے نیاز کا
جو بھڑک اٹھا بھی تو چھپ کے اوٹ میں کنج کی
تجھے کیا خبر کہ ہوائے دشت کے سیل نے
اسے کتنے زخم عطا کیے اسے کیا دیا

خلابیکراں

تہی نور سے، تہی نار سے
تہی وقت کے سب اسرار سے
نحس، سرد، مشؤم
گھٹا، چاندنی، دھنک، کہکشاں
کوئی راہرو، کوئی کارواں
نہیں اس کا مقسوم
نہ تھا کچھ، نہ ہے، نہ ہوگا کبھی
سبھی پی کے اک گھنی تشنگی
ہوئی خود بھی معدوم
دلِ بے ثمر، رہِ بے سفر
شبِ بے سحر کا اجڑا کھنڈر
عبادت گہہ بوم
خلا بے کراں، خلا بے اماں
بنامِ شرف جو پھیلا یہاں
سبھی کو ہے معلوم

رُت مالا

(۱)

نیلے بھورے پربت تجھ پر برکھا موسم موسم برسی
تجھ کو بہا نہیں پائی
آندھی ٹکرائی پر اُڑا نہیں پائی
دھوپیں پگھلانے کو بڑھیں
تب بدلی چھتری بنی
یا شیتل شام آئی
نیلے بھورے پربت

(۲)

ہم تب بھی آزاد تھے
اب بھی ہم آزاد ہیں، دل شاد ہیں
پابندی گر ہو تو ایک ادا ہو
اپنی ہی من مانی ادا
ہٹی ضدی سدا رہیں
برباد رہیں تو بربادی اک پنچھی، ہم صیاد رہیں
ہم تب بھی آزاد تھے

(۳)

ہم پاکھنڈی جنم جنم بہتے تھے جیسے تیز ہوا

جو کچھ اپنی راہ میں آیا ہم نے اس کو ساتھ لیا
ہم نے سوچا تھم جائیں گے، تھام کے ہم کو
تھام کے ہم کو اونچی ٹہنی سے توڑیں گے گلاب
تب تک ہم نے سوچا تیز روی کا ہر ارماں ہو پورا
تیز روی کی لاج رہے
ہم پاکھنڈی . . .

(۴)

دھند میں ڈوبے بھیگے جنگل راز بھرے، آمادہ
دام بچھاتے ہیں گنجان درختوں کے
تکتی تکتی !
نہیں نہیں —— یہ تو نرم ہوا
اس میں گھلا ملا ہے انساں اور خدا کا دل
نرم ہوا آنکھوں کو بند کیے دیتی ہے راحت سے
اور ستارے نیلمبر کے کتنے روشن ہیں
تکتی تکتی !

نہیں نہیں —— یہ نرم ہوا

(۵)

دور کہیں تاریک ڈھلانوں میں جادوگر زہر پکاتے
کالی پرانی دیگوں میں
ساہی ایسے کانٹوں والی ڈھانچہ ڈھانچہ شبیہیں
غاروں میں جنبش کرتی
ان کے آگے جلتی نیلی پیلی آگ
دیکھ کے جس کو ہم دہشت میں پڑے

ہم جگتی آنکھیں بھی، ہم اُڑتی جگائیں بھی
ہم سب سے گہری تھاہ
سبھی افقوں سے پرے کا افق
ہم سب شکھروں سے اونچا شکھر
دہشت میں پڑے
دور کہیں تاریک ڈھلانوں میں

(۶)

اور سرا کی
بھیگے پچھلے گلابوں کا جل چھلکاتی
بسراوے کی نرمل جوت شیر سی چمکیلی دھارا بہتی ہی رہی
تن من تن سب نرک بجھے
سب کھاو بنے
اور سنہری دھانی نقطوں والی دھرتی اُبھری
پاٹ گئی تاریک ڈھلانوں کو
سارے نشیب ہیں قدِآدم اونچے بنفشوں میں ڈوبے
بسراوے کی نرمل جوت شیر سی چمکیلی دھارا بہتی ہی رہی
اور بہار آئی
وہ شیریں کچا میٹھا رس
جو اس دھانی نازک بیل سے ہم نے پایا
اپنے غم میں آس کے جوش کو دیکھ کے ہم حیرت میں ڈوبے
تازہ گلوں کا شہد دلوں سے، لہجوں سے آنکھوں سے چھلکا
اور بہار آئی

قاضی سلیم

کھلونے

جھن جھنا جھن ناچتی گڑیا
ٹھمکتی تالیوں پر تالیاں دیتی بندریا
گڑیاں بڑھ کر ٹرٹر ڈانٹتا انگریز
وحشی ریچھ اُچھلتے
مست ہاتھی سر ہلاتے جھومتے
اک نمائش گاہ میں سب موسیقے

روز و شب کے بیچ آ لٹے گھومتے کھلتے رہے
اور روحیں کل کے گھوڑے پر سوار
آباد ویرانوں سے اُڑ کر
اک طلسمی شہر میں پہنچیں
یکایک یوں لگا
جیسے وطن میں لوٹ کر پھر آ گئیں

روز و شب کے بیچ اُلٹے گھومتے کھلتے رہے
نو دمیدہ اور ننھے پھول
اپنی تختیاں بستے اٹھائے بے نیازانہ بڑھے
دیوار ماہ و سال کے ہر ایک روزن سے نکل کر
یک بیک اگلی صفوں میں آ گئے۔

وائرس

ابھی ابھی تو لب ملے تھے کتنے پیار سے
زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آگیا
مسیحِ وقت تم بتاؤ کیا ہوا
ذرا سی دیر کے لیے پلک جھپک گئی
تو راکھ کس طرح جھڑی

سُنا ہے دور دیس سے
کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آ گئے
جن کے تاب کار سحر کے لیے
امرت اور زہر ایک ہیں
اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں
کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں

ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی
رگوں میں جیسے بددعائیں تیرتی ہیں پھانس کی طرح

مسیحِ وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیوِ علم کے چراغ کا

کیوں بھلا بچھڑ گیا
دھواں دھواں بکھر گیا

سنو کہ چیختا ہے —
"کام — کوئی کام"

کچھ نہیں
جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو
یا کروڑوں سال کے لیے
خدا کی آخری شکست تک
سمندروں کی ریت چھانتے رہو

مُکتی

گرجتی،
ٹوٹ کر گرتی گھٹائیں
آسمانوں سے مسلسل سنگ باری
نوحہ گر دیوار و در
زخمی چھتیں
شیشوں پہ پانی قطرہ قطرہ پھیلتا بڑھتا
پھسلتی، ٹوٹتی ننھی لکیریں
جو تھکے ہاتھوں کی ریکھاؤں کی صورت
نت نرالے روپ بھرتی ہیں

خلا دل کا ذرا سی دیر بھی خالی نہیں ہوتا
اسے جو بھی میسر ہو وہ بھر لیتا ہے سینے میں
تمنا پھر تمنا ہے
وہ چاہے موت ہی کی ہو
وہی دکھتی رگوں میں خون کے طوفاں، تھپیڑے
پھر وہی شیشوں پہ بڑھتے پھیلتے جالے
پلاؤں کی آخری بے جان سی
اک پھڑ پھڑاہٹ کے سوا کیا ہیں

یہ فریاد و فغاں، نالے

مجھے معلوم ہے جب وقت بہتا ہے
تو پھر موجوں میں کب وہ فرق کرتا ہے
وہ چاہے پرسکوں ہوں،
یا کسی ساحل سے اپنے سر کو ٹکرائیں
سسکتی رینگتی گزریں
تڑپ کر ریت میں خود جذب ہو جائیں۔
وہ چاہیں کچھ کریں
کیا فرق پڑتا ہے
پھسلتی، ٹوٹتی ننھی لکیریں
درازوں سے نکل کر فرش تک آنے لگیں — لیکن
وہ کتنی دور تک یوں رینگ سکتی ہیں
دلاسے، ریشمی پیغام، خواب آلودہ تمنائیں
بھلا اس سنگ باری کی سپر کیسے بنیں گی

ہزاروں کائناتیں ٹوٹتی، بنتی ہیں ہر لحظہ
تناور پیڑ گرتے ہیں
چٹانیں ریزہ ریزہ ہو کے نس نس میں کھٹکتی ہیں
دریچے پے بہ پے برسات کے حملوں سے اندھے ہیں
فضا گونگی ہے، بہری ہے
چلو یہ زندگی اور موت دونوں آج سے میرے نہیں ہیں
مری آنکھوں کی بینائی
زباں کی تاب گویائی
سماعت، لمس، سب کچھ آج سے میرے نہیں ہیں

چلو میں بھی تماشائی ہوں خود اپنے جہنم کا
مری دنیا تماشہ ہے
میں اپنے سامنے خود کو تڑپتا، سر پٹکتا دیکھ سکتا ہوں
اور ایسا مطمئن ہوں آج جیسے یہ جنم مجھ کو
ابھی کچھ دیر پہلے ہی ملا ہے
اور کسی انجانی دنیا سے
برستے بادلوں کے ساتھ آیا ہوں

عزیز قیسی

زہریلے پانیوں میں

تم کبھی مل سکو گی مجھے ؟
کتنا عرصہ ہوا ہم کو بچھڑے ہوئے
ہر برس کے مہینے، مہینوں کے دن رات، دن رات کی ساعتیں اور لمحات
یہ رائگاں عمر اپنی (اسے رائگاں کیوں کہیں یہ ہماری جدائی کا اک عہد ہے ؛
بے کنارہ سمندر ہے جو مر رہا ہے (مگر موت اس کا کنارہ ہے اور اس
کنارے سے پہلے کہیں) تم سے گر سامنا ہو تو یہ سوچتا ہوں مجھیں کیا کہوں گا
کہ اس بے کراں عمر سے چند گنتی کے لمحات تم کو ملے —— اور یہ عمرِ وفا
بے حقیقت جزیرہ ہے —— لیکن کبھی کوئی درد آشنا جب ادھر سے
گزرتا ہے، کہتا ہے "دیکھو جزیرہ کوئی، یہ سمندر کے دل کا
کہیں کینسر تو نہیں ؟"

رسولِ کاذب

رسولِ مصلوب کے دو ہزار برسوں کے بعد یہ واقعہ ہوا....

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب رسولِ خورشید راس الافلاک پر چمکتا تھا
وہ اک زمستاں کی نیم شب کا سماں تھا
(وہ نیم شب، اک رقیق چادر، نہ جانے کب سے زمیں کے مُردار کا لبد پر
پڑی ہوئی ہے اور اس کے مسموم روزنوں سے گلے سڑے جسم کا تعفن اُبل رہا ہے)
شجر حجر دُھند کے کفن میں چھپی ہوئی خامشی کے سینے میں چھپ رہے تھے
عناصرِ وقت منجمد تھے
تمام روحیں فشارِ مرقد میں مبتلا تھیں
اور ایسے ہنگام میں اک آوازِ زور افگن
ظہورِ خورشید کی بشارت سے دشت و در کو جلا رہی تھی
ہزار ہا شب گزیدگاں کے ہجوم سے جس نے اس کو دیکھا
وہ خونِ آدم میں اپنی زندہ خزاں زدہ انگلیاں ڈبوئے ہوئے کھڑا تھا

ہجوم سے ایک اک گنہگار کو بلاتا اور اُس کے ماتھے پہ کلمۂ صبح لکھ رہا تھا
تمام مُردے خزاں زدہ انگلیوں کے چھونے سے جاگتے تھے
گناہگارِ نفس تھا میں بھی
امیدوارِ شفا تھا میں بھی
پھر اُس زمستاں کی نیم شب میں ہزار لمحات شاق گزرے

اور ایک لمحے نے میرے زخمِ جگر کو چھو کر کہا :

مداوائے غم کی ساعت قریب ہے

سجدہ ریز ہو جا

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب زمین کے بے شمار مُردے لہو کا پتسمہ لے رہے تھے

(لہو کا پتسمہ لے رہے ہیں!)

رسولِ خورشید کی صدا بھی مرتی گئی، گُہر میں وہ کھو گیا، اور .....

اُسی زمستاں کی نیم شب میں خبر ملی ہے
کہ اک شبستانِ نور و نکہت میں بے کفن لاش پر وہ بیٹھا ہوا ہے
اپنے خزاں زدہ ہاتھ سے کسی کے لہو کی تقطیر کر رہا ہے
اور اپنے کاسے کو بھر رہا ہے
خبر ملی ہے،
لہو وہ خورشید کا لہو ہے۔

مخنی تبسم

رشتے

میں کیا جانوں، کون ہے سورج، کس نگری کا باسی ہے
کیسا سرچشمہ ہے جس سے جیون دھارا بہتی ہے
میں کیا جانوں کون ہے بادل، کیوں آوارہ پھرتا ہے
کتنے پیڑ ہرے ہوتے ہیں، کتنی کلیاں مرجھاتی ہیں
ایک نگاہِ لطف سے اس کی، اس کے ایک تغافل سے

میں کیا جانوں، شب کے گہرے سناٹوں میں
کتنے تارے ٹوٹ گئے ہیں
کتنی پلکیں بھیگ چکی ہیں، کتنے آنسو خشک ہوئے ہیں
صدیوں کے ملبے کو ہٹا کر دیکھو
کتنی روحیں اپنے اپنے پنجر ڈھونڈھ رہی ہیں

میں کیا جانوں کیا ہے دنیا
انسانوں کی بستی ہے یا ایک سرائے فانی ہے؟

میں تو ابھی بستر سے اٹھا ہوں اور مری آنکھوں میں اب تک
خواب کا سا ما منظر ہے:
میرا پوتا چاند میں بیٹھا اپنے بیٹے سے کہتا ہے
"دیکھو وہ دھرتی ہے، اس میں دادا ابا رہتے تھے۔"

محمود ایاز

شب چراغ

بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدّت
بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا یہ جمِ غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آوازِ پا سے رو گرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں
اور اس ہجوم سرِ راہ سے گزرتے ہوئے
نہ جانے کیسے تمھاری دعا، کرم کا خیال
مری جبیں کو کسی دستِ آشنا کی طرح
جو چھو گیا ہے تو اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے
سموم و ریگ کے صحرا میں اک نفس کے لیے
چلی ہے بادِ تمنا تو عمر بھر کی تھکن
سمٹ سمٹ کے سمٹ آئی ہے ایک آنسو میں
یہ وہ گہر ہے جو ٹوٹے تو خاک پا میں ملے
یہ وہ گہر ہے جو چمکے تو شب چراغ بنے

اسپتال کا کمرہ

تمام شب کی دُکھن، بے کلی، سُبک خوابی
نمودِ صبح کو درماں سمجھ کے کاٹی ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی ہر آہٹ
اجل گرفتہ خیالوں کو آس دیتی ہے
مگر وہ آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

اُفق سے صبح کی پہلی کرن ابھرتی ہے
تمام رات کی فریاد اک سکوت میں چُپ
تمام شب کی دُکھن، بے کلی، سبک خوابی
حریری پردوں کی خاموش سلوٹوں میں گم
جو آنکھ زندہ تھی، خاموش چھت کو تکتی ہے
مگر وہ آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

نمودِ صبح کی زرتار روشنی کے ساتھ
مہکتے پھول دریچے سے جھانک کر دیکھیں
تو میز و در پہ کسی درد کا نشاں نہ ملے

’اگالدان، دواؤں کی شیشیاں، پنکھا
کنواری ماں کا مجسمہ، صلیب آویزاں
ہر ایک چیز بدستور اپنی اپنی جگہ
نئے مریض کی آمد کا انتظار کرے
اور ایک آنکھ، جو سب دیکھتی ہے
ہنستی ہے!

باقر مہدی

گوڈو[۱]

ہوائیں چلتی ہیں، تھمتی ہیں، بہنے لگتی ہیں
نئے لباس، نئے رنگ، روپ، سج دھج سے
پرانے زخم نئے دن کو یاد کرتے ہیں
وہ دن جو آ کے نقابیں اتار ڈالے گا
نظر کو دل سے ملائے گا، دل کو باتوں سے
ہر ایک لفظ میں معنی کی روشنی ہوگی

مگر یہ خواب کی باتیں، سراب کی یادیں
ہر ایک بار پشیمان دل گرفتہ ہیں
صبح کے سارے ہی اخبار وحشت افزا ہیں
ہر ایک رہبر و رہزن کی آج بن آئی
کہ اب ہر ایک جیالا ہے سورما سب ہیں

بتاؤں کس سے کہ میں منتظر ہوں جس دن کا
وہ شاید اب نہ کبھی آئے گا زمانے میں
کہاں پہ ہے مرا "گوڈو" مجھے خبر ہی نہیں

---

۱ سیموئل بیکٹ کا علامتی کردار

اُسے میں ڈھونڈھ چکا روم اور لندن میں
نہ ماسکو میں ملا اور نہ چین و پیرس میں
بھلا ملے گا کہاں بمبئی کی گلیوں میں

یہ انتظارِ مسلسل، یہ جاں کنی، یہ عذاب
ہر ایک لمحہ جہنم، ہر ایک خواب سراب

ریت اور درد

مدتیں گزریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں
کہ اُڑے ریت، مٹے نقشِ سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لے کر
پیاس جاگ اُٹھے، سکوتِ دلِ مضطر ٹوٹے
تاکہ میں دیکھ سکوں
اپنی بے خواب سی آنکھوں سے وہ منظر اک دن
ریت کے تودے فضاؤں میں اُڑے جاتے ہیں
اور خوش ہو کے کہوں
زندگی ریت سہی، درد کا چشمہ بھی تو ہے

راہی معصوم رضا

چاند کی بڑھیا

ماں سے اک بچے نے پوچھا
چاند میں یہ دھبا کیسا ہے
ماں یہ بولی
چندا بیٹے
جس کو تم دھبا کہتے ہو وہ تو اک پاگل بڑھیا ہے
بچے نے معصوم آنکھوں سے کچھ لمحوں تک ماں کو بڑی حیرت سے دیکھا
اور یہ پوچھا:
ماں! جب میں چندا بیٹا ہوں تو مجھ میں بھی اک پاگل بڑھیا ہوگی
ماں نے اس کو بھینچ لیا
اس کے لب چومے
گردن چومی، ماتھا چوما
اور یہ بولی: ہاں تجھ میں بھی اک بڑھیا ہے

ایک منظر

بانس کے جھنڈ میں
چاندنی جب دبے پاؤں داخل ہوئی
پتّیوں کے بچھونوں میں دبکی ہوئی سدھ ہی تھی ہوا
جاگ اٹھی،
اک ذرا ہٹ کے تالاب کی گود میں
گھس کے سوئی ہوئی ننھی لہروں نے آنکھیں ملیں
کلبلانے لگیں
اور کہن سال ٹیلوں پہ بیٹھے ہوئے
کچھ کہن سال پیڑوں کی پرچھائیاں
سر ہلانے لگیں
—— دور اندھیرے کے تالاب میں
ڈبکی مارے ہوئے گاؤں نے
سر نکالا اور اک سانس لی

شہاب جعفری

سورج کا شہر

(غریبِ شہر کی ڈائری سے)

"نہیں! — یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ گردش میں کیوں نہیں ہے؟
پڑھو تو اس ڈائری میں کیا ہے؟"

پھٹے کچھے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا: —

"میں اپنی دنیائے فکر و فن تج کے آج بن باس میں پڑا ہوں
ضرورتوں میں گھرا ہوا ہوں
یہاں تو دو اور دو کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا
کہ پانچ ناممکنات میں ہے
عظیم فن کار کا قلم ہو کہ کارخانے
کسی کو تخلیقِ حسن کی آرزو نہیں ہے
مقدس آگ ان کے دل کی یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں وہ صرف زندہ ہی رہنے میں صرف ہو رہی ہیں
مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیسے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے
مشین کی طرح پاؤں چلتے ہیں
آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے

ارادہ و اختیار اک اضطرابِ سنگیں ہے جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک کے بات کرلے
(کسے خبر، آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس گیا ہوں)"

یہاں یہ تحریر آنسوؤں سے مٹی ہوئی تھی اور اس سے آگے

"یہ شہر سورج کا شہر ہے، اس کے روز و شب کا پتہ نہیں ہے
نہ آج تک وقت اور تاریخ کا مجھے علم ہو سکا ہے
کہ میرے احساس میں کوئی آج ہے نہ کل
اور یہ رات ہے یا سیاہ سورج؟
غروب ہو کر بھی آسمان و زمیں سے پیہم گزر رہا ہے
بس اس جہاں میں سیاہ و روشن ہمیشہ دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پہ کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے ایک پہیئے پہ چل رہی ہے
زمیں کا چاند کیا خبر کس اندھیرے پاتال میں گرا ہو
ہر ایک شے بھاگتی ہوئی ایک دوسرے کی تلاش میں گم
بس اک تصادم
ہر ایک شخص ایک دوڑتی لاش ہے کہ اک دوسرے سے وحشت زدہ، گریزاں
سب اپنا سورج سے منہ چھپائے تلاش میں وقت کی ہراساں
کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں کہ تھوڑا اداس ہولیں"
یہاں پہ جملے عجیب سے تھے، لہو کے دھبوں سے مٹ گئے تھے

مظہر امام

اکھڑتے خیموں کا درد

کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں

عقیدے زخموں سے چور پیہم کراہتے ہیں
یقیں کی سانس اکھڑ چلی ہے
جمیل خوابوں کے چہرۂ غمزدہ سے ناسور رس رہا ہے
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں قوسِ قزح کی انگڑائیاں جن سے ٹوٹتی تھیں
نہ فرد ہی کا مکاں سلامت
نہ اجتماعی وجود ہی زیرِ سائباں ہے
کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے؟
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟
مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ ریت کی طرح اڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے

"مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ"
مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السّلام ہوگا

عمیق حنفی

آئینہ خانے کے قیدی سے

ذات کا آئینہ خانہ
جس میں روشن اک چراغِ آرزو
چار سو
زعفرانی روشنی کے دائرے
مختلف ہیں آئینوں کے زاویے
ایک لیکن عکسِ ذات
اک اکائی پہ اسی کی ضرب سے
کثرتِ وحدت کا پیدا ہے طلسم
خلوتِ آئینہ خانہ میں کہیں کوئی نہیں
صرف میں —
میں ہی بُت
اور میں ہی بُت پرست
میں ہی بزمِ ذات میں رونق فروز
جلوہ ہائے ذات کو دیتا ہوں داد
جب ہوائے شوخ کی موجِ شریر
توڑ جاتی ہے کسی کھڑکی کے پردے کا جمود
تو بگڑ جاتا ہے کھیل
دیو قامت عکس کو بونا بنا دیتی ہے باہر کی کرن

اے مری نامستعد مجہول ذات

اے کہ تو از خود نظر بند آئینہ خانے میں ہے
سوچتی ہے تو کہے گی جو ہے اب تک ان کہا
اور کچھ کہتی نہیں
سوچتی ہے تو لکھے گی شاہکار
اور کچھ لکھتی نہیں
سوچتی ہے تو جہانداری کی بات
اور کچھ کرتی نہیں
سوچتے ہی سوچنے میں ساعتِ تخلیق جب
تیرے شل ہاتھوں سے جاتی ہے پھسل
تو بلک پڑتی ہے تو

اے مری نامستعد مجہول ذات
خلوتِ آئینہ خانہ سے نکل
اے چراغِ آرزو
اس طرف ضو پاش ہو
جس طرف ہے شاہراہِ جستجو

تاش اور شطرنج کے شاہوں سے برتر ہے کہیں
وہ پیادہ جو چلے
وہ پیادہ جو چلے خود اپنی چال
اے مری نامستعد مجہول ذات
کوئی فکر،
کوئی کام،
کوئی بات ——!

جنگل

(ایک ہشت پہلو تصویر)

شہر کے آرے چلاتے، بے سُرے، بدرنگ، شور و غل سے دور
پاک رنگوں کا صنم آباد
پاک آوازوں کا اک گندھرو لوک
شہر والوں میں ہے جنگل جس کا نام
صبح جس کی ایک ارژنگ اور البم جس کی شام

وہ لچکتی فصل کے پہلو میں کہنی مار کر کلکاریاں بھرتی ہوا
جھن جھنا اُٹھتے ہیں بوٹے، جھم جاتے تار
ٹیپ پڑ جاتی ہے بل کھاتی ہوئی آواز
چھڑ گئی ہو دور جیسے جل ترنگ
دوڑتی ہے سنسنی ایسی امنگ
جیسے پانی میں ہزاروں مچھلیاں اک ساتھ کودیں اور چادر چیر جائیں
جیسے پتّے کام والی ساڑیاں لہرائیں، سرسر سرسرائیں
کن کنائیں جیسے ہنسوں کے ہجوم
گن گنائیں سرمدی نغمے نجوم

وہ سنہری چولیوں میں کسمساتے، گول اُبھرے سانولے ٹیلے
گول اُبھرے سانولے ٹیلے، سنہری، تنگ، روشن چولیاں
کسمساتے گول اُبھرے سانولے گدرائے بھاری سخت ٹیلے

وہ سنہرے بن گوپیاں واں پھاڑ کر خود پھوٹ پڑا ہے شیام رنگ
بارسے ہے چاک چولی، جھانکتا ہے سانولی دھرتی کا رنگ
(یاد آتا ہے یہاں تشبیہہ کا سمراٹ کالی داس)

وہ کھجوروں کے درختوں کی قطار اندر قطار
ایک دم سیدھی کھڑی، سپندھ ریکھائیں زمین و آسماں کے درمیاں
آسمانی شامیانہ ان ستونوں کے سروں کو چھوڑ کر
بے ستوں گنبد سا خود ٹکا ہوا

آم کی ڈالوں پہ چکنے سبز پتے
سبز پتوں پر لٹکتی کیریاں
سبز ننھی کیریاں
رنگ، رس اور سواد کے خوابوں کی تعبیروں کے انکھوے کھل گئے

سبز پیلا، سبز بھورا، سبز کالا، سبز زریں، سبز نیلا
سبز سبز، سبز سبز
سبز غالب رنگ کتنی جوڑیوں کے ساتھ ہے پھیلا ہوا
سبز غالب رنگ، باقی رنگ گویا اس کے شیڈ
راس منڈل میں کنھیا سبز، باقی رنگ اس کی گوپیاں

تیز بے حد تیز، بے دم، ہانپتی موج ہوا کی لے
تیز بے حد تیز لیکن نغمہ ریز
جھومتا، گاتا، تھرکتا، ناچتا ماحول
ایک لے میں رقص کرتے ہیں فضا، دیہات، جنگل، کھیت
رقص میں ہے موج رنگ

موج میں آواز
اور پھر آواز میں خوشبو کا رقص
سب کے سب ہیں ایک لے کے دائرے میں ہم نوا، ہم رقص باہم ایک
دور تک پھیلاؤ، آزادی، محبت اور چنچل شانتی
ایک جیتی جاگتی تابندہ زندہ شانتی
پھولتے پھلتے، سنورتے، کر گزرنے کا کھلا امکان

شہر والوں میں ہے جنگل جس کا نام

مشین زادوں کی بستی میں

ایک دیوار کے اُس طرف
گھر میں ہمسائے کے ناچ گانے ہوئے
شادیانے بجے
رات بھر جشن ہوتا رہا
اور دیوار کے اِس طرف
لوگ سوتے رہے

شارعِ عام پر حادثہ ہو گیا
آدمی کٹ گیا
اس کا سر پھٹ گیا
بھیڑ بہتی رہی
بات کرنے میں جو تھے مگن
بات کرتے رہے
قہقہے چیخ کے پر کترتے رہے
اور اکثر جو خاموش تھے
چپ گزرتے رہے
آدمی مر گیا

اک محلّے میں دوپہر کو
عین بازار میں
قتل کا واقعہ ہو گیا

اور پولس گواہوں کی خاطر بھٹکتی رہی
دھڑدھڑاتی ہوئی ٹرین آئی — گئی
اور پہیوں کی جھنکھاڑ سے کان پھٹنے لگے
ٹرین کی پٹریاں جیوں پڑی تھیں پڑی ہی رہیں
نہ ہوئیں ٹس سے مس

آدمی ٹرین کی پٹریاں بن گئے
ٹرین کی پٹریاں آدمی بن سکیں گی کبھی ؟!

(طویل نظم "سعد باد" سے)

زبیر رضوی

تبدیلی

صبح دم جب بھی دیکھا ہے میں نے کہیں
ننھے بچوں کو اسکول جاتے ہوئے
رقص کرتے ہوئے، گنگناتے ہوئے
اپنے بستوں کو گردن میں ڈالے ہوئے
انگلیاں ایک کی ایک پکڑے ہوئے

صبح دم جب بھی دیکھا ہے میں نے انھیں
ماتا ان کی راہوں میں سایہ کرے
اُن کے قدموں میں خوشبو بچھایا کرے
دیوتا اُن کے ہاتھوں کو چوما کریں
من ہی من ان کی باتوں پہ جھوما کریں

صبح دم جب بھی دیکھا ہے میں نے انھیں
میرا جی چاہتا ہے کہ میں دوڑ کر
ایک ننھے کی اُنگلی پکڑ کر کہوں
مجھ کو بھی اپنے اسکول لیتے چلو
تاکہ یہ تشنۂ آرزو زندگی
پھر سے آغازِ شوقِ سفر کر سکے

مخمور سعیدی

بُلاوا

ذرا ٹھہرو! کدھر ہم جا رہے ہیں
اُدھر، اُس چار دیواری کے پیچھے
وہ بوڑھا گورکن چلّا رہا ہے:
"اِدھر آؤ قدم جلدی بڑھاؤ
یہاں اس چار دیواری کے اندر
جنم دن سے تمھاری منتظر ہیں
وہ قبریں جن کی پیشانی پہ اب تک
کسی کے نام کا کتبہ نہیں ہے"

محمد علوی

گھر

اب میں گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گا کبھی
گھر کی اک اک چیز سے مجھ کو نفرت ہے
گھر والے سب کے سب میرے دشمن ہیں
جیل سے ملتی جلتی گھر کی صورت ہے

ابّا مجھ سے روز یہی فرماتے ہیں
کب تک میرا خون پسینہ چاٹو گے؟
امّاں بھی ہر روز شکایت کرتی ہیں
کیا یہ جوانی پڑے پڑے ہی کاٹو گے

بھائی کتابوں کو روتا رہتا ہے سدا
بہنیں اپنا جسم چرائے رہتی ہیں
میلے کپڑے تن پر داغ لگاتے ہیں
بھیگی آنکھیں جانے کیا کیا کہتی ہیں

چولھے کو جی بھر کے آگ نہیں ملتی
کپڑوں کو صندوق ترستے رہتے ہیں
دروازہ، کھڑکی، منہ کھولے تکتے ہیں
دیواروں پہ جھینگے ہنستے رہتے ہیں

اب میں گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گا کبھی
روز یہی میں سوچ کے گھر سے جاتا ہوں
سب رستے ہر پھر کے واپس آتے ہیں
روز میں اپنے آپ کو گھر میں پاتا ہوں

کون؟

کبھی دل کے اندھے کنویں میں
پڑا چیختا ہے
کبھی دوڑتے خون میں
تیرتا ڈوبتا ہے
کبھی ہڈیوں کی سرنگوں میں بتی جلا کر
یونہی گھومتا ہے
کبھی کان میں آ کے
چپکے سے کہتا ہے : تو اب تلک جی رہا ہے؟
بڑا بے حیا ہے ——!
مرے جسم میں کون ہے یہ
جو مجھ سے خفا ہے۔

ابنِ مریم

تو پھر یوں ہوا
ابنِ مریم نے اک اونچے ٹیلے پہ چڑھ کر کہا:
سن رہے ہو
جہاں تم نے بویا نہیں ہے
وہاں کاٹنے کیوں چلے ہو
جہاں کچھ بکھیرا نہیں ہے
وہاں سے سمیٹو گے کیا
لاؤ، اپنے گناہوں کے پشتارے لاؤ
کہاں تک انھیں لاد کر یوں پھرو گے
انھیں دفن کر دو
تو ممکن ہے کل اس زمیں پر تمھیں
نیکیوں کے درختوں سے
لذت کے پھل مل سکیں گے

اور پھر یوں ہوا
ابنِ مریم نے دیکھا
تو میدان میں
چند بھیڑیں کھڑی تھیں
لوگ اپنے مکانوں کی جانب
گناہوں کو لادے
بڑھے جا رہے تھے
اور ٹیلے پہ تنہا کھڑا ابنِ مریم عجب لگ رہا تھا

شہریار

نیا امرت

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دوکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انساں کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو "زہر" لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے؟

اپنی یاد میں

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
دور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ
اُڑ رہے ہیں ہر طرف
فرشتے آسمان سے اُتر رہے ہیں صف بہ صف

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش
جگمگا اُٹھے
لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے

دانۂ گندم سے دوری

سمندر خشک ہوتے جا رہے ہیں
پیاس سے بے حال ننھی مچھلیوں کے غول
سمتوں کے بھنور میں پھنس گئے ہیں
ان کے پنجے ریت کی گہری تہوں میں دھنس گئے ہیں
ہم آنکھوں کو دُہائی دے رہے ہیں
اجنبی بے نام دنیاؤں کے باشندوں کی
پُراسرار چیخوں سے
فضاؤں میں سبھی کچھ منجمد سا ہو گیا ہے
زمیں پر سخت چٹانیں ابھرتی آ رہی ہیں
دانۂ گندم ہماری دسترس سے دور ہوتا جا رہا ہے

کمار پاشی

جنم دن

آسماں کی وسعتوں میں
میری نظریں
ڈھونڈتی ہیں، اس حسیں ماضی کو، جس کی
یاد کے سائے بھی گھلتے جا رہے ہیں اب ہوا میں
اور مری آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں لمحہ لمحہ

میں پرانا سا کوئی انسان ہوں، محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو
میں نے ہر ساون میں دھویا ہے بدن کو
اور یہ دھرتی مجھے روزِ ازل سے جانتی ہے
یاد ہے وہ دن مجھے اچھی طرح سے
کھولتے، چنگھاڑتے لاوے کے بے پایاں سمندر سے اچھل کر
ہم اکٹھے ہی گرے تھے

اور صدیوں بعد ہوش آیا، کھلی جب آنکھ میری
میں نے دیکھا:
میں تو صدیوں پہلے پیدا ہو چکا تھا۔

رشتوں کی پہچان

ہمیں سب پتا ہے
کہ ہم دھرتیوں کے ترانے نغموں سے
ازل سے شناسا ہیں
اور نیلگوں آسمانوں کا نقشہ بھی
ہم نے دیکھا ہے

انھیں علم بھی ہے کہ ان کے سروں پر
کوئی آسماں ہے نہ پاؤں کے نیچے زمیں ہے
فقط اک خلا بے ہوا کرب قسمت ہے اُن کی

ہمیں سب پتا ہے
انھیں لوٹنا ہے پشیمان ہو کر
سفر کے دکھوں سے پریشان ہو کر
کہ دھرتی کا اور آسمانوں کا رشتہ
ازل سے پرانا ہے
اور ایک ہی سوت میں ہم پروئے ہوئے ہیں۔

الف کی خودکشی پر چند سطریں

(۱)

جلتی بجھتی روشنیوں میں سایہ سایہ جلتا تھا
سارا کمرہ وہسکی اور سگرٹ کی بو میں ڈوبا تھا
اُبل رہا تھا زہر رگوں میں موت کا نشہ چھایا تھا
سارا منظر نقطہ نقطہ، مہمل مہمل لگتا تھا
شاید کچھ دن پہلے تک یہ کوئی بھوت بسیرا تھا
الف نہتا
ج نہتی
سارے بے ہتھیار
اپنے ملک اور اپنی قوم کے مردہ پہرے دار۔

(۲)

ج نے سارے رنگ اُتارے
اور قہقہہ مار کے گرجی
ہے کوئی دعوے دار
سارے جام اٹھا کر چیخے
تیرے ایک ہزار
ج اندھیروں باہر آئی
کیا الف پر وار
باپ ترا مقروض تھا میرا
میرا قرض اُتار

آر پار سب سائے گم سم
بھوت بنے دروازے
پریت آتماؤں کی صورت کھڑی ہوئی دیواریں
گہری - اپار خموشی
گہری، اتھاہ، اپار
بے آواز اندھیرے برسے
برسے موسلا دھار
بجلی بن کر کوندرہے تھے یہی شبد ہر بار
باپ ترا مقروض تھا میرا
میرا قرض اتار

(۳)

ایک انوکھی خبر چھپی ہے شہر کے سب اخباروں میں
سب دکانیں بند پڑی ہیں کوئی نہیں بازاروں میں
سائیں سائیں کرتی ہے، مٹی مٹی موسم ہے
آج الف کے جل مرنے پر دنیا بھر میں ماتم ہے

جلتی بجھتی روشنیوں میں سایہ سایہ جلتا ہے
ابل رہا ہے زہر رگوں میں موت کا نشہ چھایا ہے
سارا منظر نقطہ نقطہ مہمل مہمل لگتا ہے
ایلینا پائے کہتا تھا: یہ کوئی بھوت بسیرا ہے

ندا فاضلی

لفظوں کا پُل

مسجد کا گنبد سونا ہے
مندر کی گھنٹی خاموش
جزدانوں میں لپٹے
سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے
رنگ
گلابی
نیلے
پیلے
کہیں نہیں ہیں
تم اُس جانب
میں اس جانب
بیچ میں میلوں گہرا غار
لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے
تم بھی تنہا
میں بھی تنہا

پیدائش

بند کمرہ
چھٹپٹا تا سا اندھیرا
اور
دیواروں سے ٹکراتا ہوا
میں
منتظر ہوں اپنی پیدائش کے دن کا
اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا ہوں جب سے
میں خود اپنے پیٹ کے اندر پڑا ہوں

نقابیں

نیلی، پیلی، ہری، گلابی
میں نے سب رنگین نقابیں
اپنی جیبوں میں بھر لی ہیں
اب میرا چہرہ ننگا ہے
بالکل ننگا

اب میرے ساتھی ہی مجھ پر
پگ پگ پتھر پھینک رہے ہیں
شاید وہ
میرے چہرے میں اپنے چہرے دیکھ رہے ہیں۔

عادل منصوری

میرین ڈرائیو

شہروں سے تنگ آکر
شور سے دامن چھڑا کر
اونچی اونچی بلڈنگیں
خودکشی کرنے کی خاطر
صف بہ صف دریا کنارے
دیر سے آکر کھڑی ہیں

والد کے انتقال پر

وہ چالیس راتوں سے سویا نہ تھا
وہ خوابوں کو
اونٹوں پہ لادے ہوئے
رات کے ریگ زاروں میں چلتا رہا
چاندنی کی چتاؤں میں جلتا رہا
میز پر
کانچ کے اک پیالے میں رکھے ہوئے دانت
ہنستے رہے
کالی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے پھر
موتیے کی کلی سر اٹھانے لگی
آنکھ میں تیرگی مسکرانے لگی
سبز پانی کی سیال پرچھائیاں
لمحہ، لمحہ
بدن میں اترنے لگیں
روح کا ہاتھ چھلنی ہوا
سوئی کی نوک سے
خواہشوں کے دیئے
جسم ہی میں بجھ گئے
گھر کی چھت میں جڑے
دس ستاروں کے سائے تلے
عکس دھندلا گئے
عکس مرجھا گئے۔

وقت کی پیٹھ پر

وقت کی پیٹھ پر
کچے لمحوں کے دھاگوں میں لپٹا ہوا
مسجد کی سیڑھیوں پر سرکتا ہوا
ذہن نئے خودکشی کے طریقوں کا موجد بنا
وحشی راتوں کے جنگل میں بکھری ہوئی
لمس کی ہڈیاں
چن رہا ہوں نہ جانے میں کس کے لیے
جب مرے نام کے لفظ تنہا تھے لوگو!
تمھیں مسرت ہونٹوں کی خیرات
کیسے ملی یہ بتاؤ
ریفریجریٹر میں رکھی ہوئی
طشتری میں مری دونوں آنکھیں
برہنہ پڑی تھیں
وہاں تک کسی خواب کے ہاتھ پہنچے نہیں تھے
کبوتر کی آنکھوں میں
اڑتے ہوئے آسماں کا تنزل نہ دیکھو
بدن کے شکستہ کھنڈر سے
نکل بھاگنے کے لیے پھر
تمھاری مدد کی ضرورت ہے مجھ کو

عرفان

رات اماوس کی تھی، میں نے
ناگ پھنی کے اک کانٹے پر
اک پل کے سوویں حصے تک
سورج کو روشن دیکھا تھا
پھیل گیا میری آنکھوں میں
سو راتوں کا گھور اندھیرا
اور مجھے محسوس ہوا یوں
گھور اندھیرے کے سینے میں
میں بجلی کا اک کوندا ہوں۔

ساقی فاروقی

مُردہ خانہ

مری رگوں میں خنک سوئیاں پروتا ہوا
برہنہ لاشوں کے انبار پر سے ہوتا ہوا
ہوا کا ہاتھ بہت سرد، موت جیسا سرد
وہ جا رہا ہے، وہ دروازے سر پٹکنے لگے
وہ لیمپ ٹوٹ گیا، سائے ساتھ چھوڑ گئے

وہ نچتے ہوئے بھیجے کسی رقیق سے تر
وہ رینگتے ہوئے بازو، وہ چیختے ہوئے سر
وہ ہونٹ نیم تراشیدہ، دانت نکلے ہوئے
وہ نصف دھڑ چلے آتے ہیں رقص کرتے ہوئے
وہ جسم کٹے ہوئے بند مرتبانوں میں
جو بات کی تو انھیں تیز و ترش نشتر ملا
جو چپ ہوئے تو انھیں سولیوں پہ ٹانگ دیا
چھپی ہیں سیکڑوں بد روحیں ان فضاؤں میں
وہ گھورتی ہوئی آنکھیں کہیں خلاؤں میں
زمیں کے مالکِ دیرینہ کی تلاش میں ہیں
جراحتوں کے نشاں ہر خمیدہ لاش میں ہیں
اور اک صدا چلی آتی ہے ہر جراحت سے
یہ سارے زخم مقدر ہوئے ہیں موت کے بعد
سکونِ لفظ و بیان و سکوتِ صوت کے بعد

بڑی بساند ہے ٹھٹھری ہوئی ہواؤں میں
میں گھر گیا ہوں لہو چاٹتی بلاؤں میں
وہ اک بُریدہ زباں آئی لڑکھڑاتی ہوئی
ہنسی ــــ ڈراؤنی سرگوشیوں میں کہنے لگی
تم اپنی لاش لیے بھاگ جاؤ جلدی سے
نہ سن سکو گے کہ ہیں موت کے فسانے بہت
متاعِ جسم سلامت کہ مُردہ خانے بہت

موت کی خوشبو

جدائی محبت کے دریائے خوں کی معاون ندی ہے
وفا یاد کی شاخ رگِ جاں سے لپٹی ہوئی ہے
دل آرام مشتاق سب خواب کے دائرے میں کھڑے ہیں
ہواؤں میں برسوں کی باسی مہک ہے
نگاہوں میں خوابوں کے ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں
دنوں کے کھنڈر یہ دلوں میں اشکوں سے سیلے چھپے ہیں
رگوں میں کوئی مدھم سم بہہ رہا ہے

مگر درد کے بیج پڑتے رہیں گے
مگر لوگ ملتے بچھڑتے رہیں گے
یہ سب غم پرانے
یہ ملنے بچھڑنے کے موسم پرانے

پرانے غموں سے نئے غم اُلجھنے چلے ہیں
لبوں پر نئے نیل، دل میں نئے بیج پڑنے لگے ہیں
غنیم آسمانوں میں دشمن جہازوں کی سرگوشیاں ہیں
ستاروں کی جلتی ہوئی بستیاں ہیں
اور آنکھوں کے رادار پر صرف تاریک پرچھائیاں ہیں

ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کے سرخ آبدوزوں میں بیٹھے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے چلے جا رہے ہیں
کراں تا کراں ایک گاڑھا کسیلا دھواں ہے
زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے ؟ !

نوحہ

یہ کیسی سازش ہے جو ہواؤں میں بہہ رہی ہے
میں تیری یادوں کی ساری شمعیں
بجھا کے خوابوں میں جل رہا ہوں
تری محبت مجھے ندامت سے دیکھتی ہے
وہ آبگینہ ہوں خواہشوں کا
کہ دھیرے دھیرے پگھل رہا ہوں
یہ میری آنکھوں میں
کیسا صحرا ابھر رہا ہے
میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں
شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا تھا
وہ مر رہا ہے

سلیم الرحمٰن

پا بہ گِل

اک بھکاری کی مانند
اک پیڑ ویران سے راستے پر کھڑا ہے
کوئی بھولا بھٹکا مسافر جو گزرے کبھی
ایک پل کو رکے
نرم چھاؤں میں دم لے ذرا
اور چلتا بنے
رہگزر پر وہ بے آسرا پیڑ چپ چاپ تکتا رہے
اپنے دامن کو پھیلائے
ہر جانے والے مسافر کو شاخیں پکاریں
مگر کون آئے ؟

پاگل پن

کون مجھے یہ سمجھائے گا
خوشبو کے پیچھے مت جاؤ
اس کی منزل کوئی نہیں ہے
شام کی حد سے دور نہ دیکھو
رنگوں کی دہلیز سے آگے
کچھ بھی نہیں ہے

اندھیارے کی ساری راہیں
بھیدوں کے جنگل کی جانب جاتی ہیں
دور ہی دور سے انجانی آوازیں
مجھ کو اپنے پاس بلاتی ہیں

خوشبو کے پیچھے ہی پیچھے
میں کس دیس میں آنکلا ہوں
اک بوجھل سی لاش کی مانند
آوازوں کے اس ساگر میں
ڈوب گیا ہوں

انجام

دل کو دھڑکاتی ہوئی سب آہٹیں چپ ہو گئیں
سانس کی سرگوشیاں میٹھی ہوا میں کھو گئیں
خواہشوں کی دلہنیں کروٹ بدل کر سو گئیں

دور کیسے ہو گئے ہیں ہاتھ وہ خوشبو بھرے
وہ چمکتے راستے، گنبدِ نگر جادو بھرے
اب تو ہیں جھونکے ہوا کے دکھ بھرے آنسو بھرے

شام جب آئے کسی ویران گوشے میں چلو
چپکے چپکے اپنے دکھ کی آگ میں جلتے رہو

افتخار جالب

دُھند

روشن۔ روشن۔ روشن۔
آنکھیں یوں مرکوز ہوئی ہیں جیسے بس ہی میں ہوں
مجھ میں لاتعداد فسانے اور معانی ہیں
میں صدہا اسرار چھپائے پھرتا ہوں
میں خوش قسمت ہوں، میرے ساتھ جہانِ رنگ و رعنائی ہے
اور دریچہ بند نہاں خانوں سے روحِ یزداں کی خوشبو اٹھتی ہے
میرا سر و شام معطر کرتی ہے
اور مری تقدیر جہاں پر خلق ہوئی ہے
جو ارمان کسی کے دل میں ہے، میں اس کی خوشبو ہوں
واحسرت کا ارض و سما میں پھیلا نغمہ
جب محبوب تلک جا پہنچے
تو پھر میں آواز نہیں رہتا ہوں
اور نہ شریانوں کا بہتا خون خرابہ
بلکہ لفظِ مطلق بن جاتا ہوں

آنکھیں یوں مرکوز ہوئی ہیں جیسے میں ہی میں ہوں، اور نہیں ہے کوئی
سچی بات مگر ہے اتنی
میں مُردار سمندر ہوں
احساسِ زیاں کا جھونکا ہے

آنکھیں بول نہیں سکتی ہیں
اور بدن بینائی سے محروم ہوا ہے
لیکن میں تو اب تک خواب زدہ تصویریں دیکھ رہا ہوں
اور سمندر کے پربت پر ٹھہرا جنگل
بہتے گیتوں سے پُر جنگل
ازلی خاموشی کے ہالے میں تھر تھر کانپ رہا ہے
صدیاں، سائے، شوخ فصیلیں، آشا صدّقنا،
ایلو!، سورج، چاند، ستارے دھرتی کے سینے پر اُترے
میری راہگزر پر بکھرے
ہلکی، مدھم اور مسلسل حرکت۔
منزل، پھول، کنول کا پھول، عدم کے بحرِ بے پایاں میں
تنہا جھولے
باہر پہ مرکوز نگاہوں سے مخفی لفظِ مطلق
تنہا اور اُداس کنول پر جھلمل جھلمل چھوٹ بہا
موہوم ردائے کوہ و دشت و دمن
دنیائے من و تو پرچھائی
پھیکی پھیکی ہو کر پھیل گئی، دھول بنی
اپنا گاؤں، گوری کے پاؤں تک دُھندلائے
پچھلی روشن اور نرالی دُھند، اور دُھند.... اور دُھند

تنہائی کا چہرہ

دھوپ نے سائے پھونک دیے ہیں
دیواریں تنہائی کا چہرہ ہیں
اور کوئی دانائے رازِ نگر بالائے بام نہیں کہ شانِ مجوبی کو پائے
اپنی روح سلگتی دیکھے، ابریشم کے نازک اور ملایم پردوں سے باہر آئے
اور مری حرمت کی چاک گریبانی کی گرم بہاریں جانے
میں نے زہد و تقویٰ کا ملبوس اُتار دیا ہے
اور پراگندہ مٹی میں دفن گنہ سے صدہا صد سالوں پوشیدہ تن کو میلا کر کے
عریاں کر ڈالا ہے
لیکن اب تو شب کا نور نکھر آیا ہے، سورج جاگ پڑا ہے
سارے سائے خاک ہوئے ہیں
اور بدن آلایش سے آلودہ نہیں
دیواریں ہیں، دیواریں، جو تنہائی کا چہرہ ہیں
اس چہرے میں وہ چہرہ ہے
جس کو روزِ ازل سے ڈھونڈھ رہا ہوں
میری کوئی راہ نہیں ہے، ساری راہیں میری ہیں
میں سرگشتہ، میں خوابوں کے محمل میں ہفت سماوات اور زمیں لے کر چلتا ہوں
لیکن دیکھ نہیں سکتا ہوں
میرا تو گھر بار نہیں ہے
میں وہ نوشہ ہوں، جس کی ہے بارات، نہ کوچہ آنگن

آنے والے آئیں بھی تو خواب رہیں
تقدیر نہیں، تقدیر زدہ تاریکی میں گم سائے
میں سایوں کو چھونے آؤں تو دیواریں نکلیں
دیواریں، جو تنہائی کا چہرہ ہیں
ایسے میں گھل جائے، مخمل چھن جائے، حیف، مقدّر
روز و شب نے گھیر لیا ہے، راہ نہیں ہے
لیکن میں سرگشتہ ہوں کر جاؤں بوجھوں
اس کا میرا میل نہیں ہے، پھر بھی ہر شب اس کا کھوج لگاؤں
اپنی ذات فنا کر کے بھی اس کا بھید نہ پاؤں
ڈھلتی شام رواں ہو کر خالی ہاتھ سویرے آؤں
اپنا نام سناؤں، اور خوشی کا راز نہ پاؤں
اور خوشی سے مر مر جاؤں۔

جیلانی کامران

ایک لڑکی

وہ ننھی سی لڑکی، جو باغوں کی خوشبو میں سے ہے، اجنبی ہے
زمیں اس کے چاروں طرف اپنا چہرہ جھکائے بہت دیر سے دیکھتی ہے
وہ اب نرم مٹی کے پہلو سے جھانکے گی، مٹی کے چہرے
وہ مٹی کے چہرے پہ اپنا، طلوع ہونے والے دنوں کا
رگوں میں لہو جتنا بہتا ہے، اس کا
پتہ انگلیوں سے لکھے گی، وہ ہم سب پڑھیں گے

مگر ہم نے جتنا پڑھا ہے، وہ مطلب سے عاری ہے
اس نے لکھا ہے، میں اپنے وطن میں بہت دیر کے بعد سوئی ہوں
میرا زمیں سے جو رشتہ ہے، وہ ذرّے ذرّے کا سورج سے رشتہ ہے
یعنی میں لمحوں کی جادوگری ہوں

مگر میں کہاں تک اُسے اتنی دوری سے دیکھوں
وہ مٹی کے چھاپے سے باہر نکل کر مجھے دیکھتی ہے
کبھی مجھ سے کہتی ہے پانی کے قطرے میں جو کچھ چھپا ہے
وہ آنسو کا قطرہ ہے
صحرا میں جیسے پرانے زمانے کے گلشن دبے ہیں

میں سب دیکھ کر اپنے قدموں سے کہتا ہوں، تم میری قسمت ہو
میں اس پہ لکھا ہوا نقش نامہ ہوں
ساحل سے ساحل، ممالک ممالک جو چرچے ہوا کی زبانی ابھی سن رہے ہیں
وہ مٹی کا نوحہ ہے، ننھی سی لڑکی کے ہونٹوں کا گانا ہے
میں سن رہا ہوں

ایک نظم

کبھی اگر تم زمیں سے گزرو، زمیں جو ہم سب کی سلطنت ہے
تو جس طرف اک کلی کے پہرے پہ چاندنی اپنا نام خود ہے
وہاں ذرا دیر کے لیے اپنی عمر کی رفت و بود روکو
زمیں کو لمحوں کی بادشاہت میں دیکھنا چاہو
اس طریقہ سے آرزوؤں کے ساتھ دیکھو
کہ جس طرح لوگ اپنے محبوب کے بدن کو
وفات کے وقت دیکھتے ہیں

میں کچھ نہیں، اپنے گیت کا، اپنی موت کا نامہ بر ہوں
مگر، زمیں کی قسمت میں جتنی زردی ہے وہ ہوں لیکن ہزار قیمت
وہ شے ہوں جس کی عنایتوں سے کبھی ستارے زمیں پہ روشن ہیں
گاہ دل میں، بہار اور اس کے خیر مقدم کا ماجرا ہیں

اسی لیے — جب کبھی تمھارا گزر ہو — اور دن کے نیک سورج
خود اپنے موسم کی بادشاہت ہوں، تو جہاں آنسوؤں کے چشمے
فراق کی اوس ہیں، وہاں اپنی چاپ کے ساتھ
میرے سائے کی روشنی میں کبھی مرا ذکر کرنا چاہو
تو خود کو سمجھو، میں خود ہوں اور تم مرے ہی موسم کا ابر ہو
ابر، جو زمین ہی کی ملکیت کا

غبار بھی، بحر بھی ہے، رحمت کا ابر بھی ہے

خموشیاں میرے ساتھ ساری بہار کا معجزہ ہیں
سایہ، جہاں گذشتہ کئی دنوں سے تڑپ رہا ہے
وہاں پرانی زمیں نے کلیوں کا تاج پھینکا ہے
اور دنیا، کئی مہینوں کے بعد یوں خوشنما ہے جیسے
مرا مقدّر تری تمنّا سے خوشنما ہے۔

فتر احسن

مُردہ گُڑیا

وہ گڑیا
جس کی آنکھیں
چاند کی نیلی جھیل میں
اپنے عکس کو تکتی رہتی تھیں یہیں
وہ گڑیا
اب ہلتی نہیں ہے
کھاتی نہیں اور پیتی نہیں ہے
اس کی ننھی ننھی انگلیاں
برفاب ہوئی ہیں،
مدت ہوئی
کہ اب وہ اپنی پیاری شکل میں
دفن پڑی ہے۔

عباس اطہر

نیک دل لڑکیو!

نیک دل لڑکیو!
آرزو کی نمایش سے گزرو تو چاروں طرف دیکھنا
اور پھر جب تمھارے لہو میں کسی کا لہو سرسرائے
ستاروں میں آنکھیں چھپا کر دعا مانگنا،
قیدیوں، شاعروں اور محکوم آبادیوں کے لیے
اور بیمار بچوں کی ماں کے لیے
اور پھر نرم ہونٹوں کی حدت سے
جب چھاتیوں میں ہوا سنسناتی سنو
نیک دل لڑکیو! یاد کرنا انھیں جن کی قسمت میں لکھے ہوئے دائرے
ایک سے ایک رات اور دن اور تنہائیاں ہیں
ہمارے لیے چاند نکلے نہ نکلے کہ ہم ٹہنیوں سے بچھڑ کے سنبھلنے نہ پائے
ہواؤں کے کندھوں پہ روتے ہوئے دور ہوتے گئے
اور جب لوٹنے کی حدوں سے بھی آگے نکل آئے
پیچھے سے آواز آئی: "پلٹ آؤ
ہم نے تمھارے لیے آج آنسو بہائے ہیں"
ہم رات کے میہماں ہیں مگر نیک دل لڑکیو!
آرزو کی نمایش میں چاروں طرف دیکھنا
اور آنکھوں کی تحریر پڑھنا
ہماری طرف جب تمھارے سفر کا مسافر ہوا کے ستم سے گزرنے لگے
اس سے کہنا: "ٹھہر جاؤ
میرے لہو میں تمھارے لیے آرزو ہے"

ے نیک دل لڑکیو —— الوداع !
رکھنا، ہماری حقیقت سے گزرو تو آنسو بہا کر دعا مانگنا
یوں، شاعروں اور محکوم آبادیوں کے لیے
ر بیمار بچوں کی ماں کے لیے
ران کے لیے جو تمھارے بدن کا مسافر ہے لیکن
رے سفر کی شہادت ہے۔

ہل ٹیڑھا ہے

شیشے کے بدن میں رہتا ہوں
میں آج ہوں میرے پیچھے کل ہیں
پھر بھی تن تنہا ہوں
حاملہ مٹی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
سر اور پیر تصادم میں ہیں
تاریکی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں
کچی موت کے بعد جونہی زندہ ہوتا ہوں
میرے سرہانے نئی نویلی دلہن، دھوپ دہک اٹھی ہے
سر اور پیر تصادم میں
حقِ زوجیت ماتھے پر
صبح سویرے کلمہ پڑھ کے نہانا
فصل کے پک جانے تک کھیت کو پانی دیتے جانا
میں نے یہی سنا ہے
حاملہ مٹی کے اوپر سینے کے بل لیٹا ہوں
بیل ہوں، پتھریلی کھیتی میں ہانپ گیا ہوں
ہل ٹیڑھا ہے
خصی بیلوں کی سب جوڑیاں
پتھریلے کھیتوں میں ہانپ چکی ہیں

بیج بکھیرنے کے آسن بھی بدل چکے ہیں
جانے پیدائش کا لمحہ کب آئے گا
مجبوری کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہا ہوں
بیچھلے موسموں اور وقتوں کی
عمر بڑی ہے، ہانپ گیا ہوں۔

زاہد ڈار

زوال کا دن

جس دن میرے دیس کی مٹی
کومل مٹی
پتھر بن کر
محلوں اور قلعوں کے روپ میں ڈھل جائے گی
اس دن گندم جل جائے گی

جس دن میرے دیس کے دریاؤں کا پانی
ٹھنڈا پانی
بجلی بن کر
شہروں کی کالی راتوں کی زینت کا سامان بنے گا
اس دن چاند پگھل جائے گا

جس دن میرے دیس کی ہلکی، تیز ہوائیں
انسانوں کے خون سے بھر جائیں گی
جس دن کھیتوں کی خاموشی
بوجھل دھات کی آوازوں میں کھو جائے گی
اُس دن سورج بجھ جائے گا
جیون کی پگڈنڈی اُس دن سو جائے گی۔

نئے شہر

گھرے، شہروں میں رہنے سے وسعت کا احساس مٹا
لامحدود خلاؤں کی خاموشی کا
ڈر بھی مٹا

اب آرام ہے
(جنگل کا جادو اور ہواؤں کا سنگیت نہیں تو کیا ہے)
اب آرام ہے کہ اب اگیان کے پیدا کردہ ہاتھ نہیں
ظالم ہاتھ، کہ جن ہاتھوں میں ہاتھ دیے
دہشت کے ویرانوں میں میں مارا مارا پھرتا تھا
اب آرام،
(سمندر کی آواز نہیں تو کیا ہے)
اس بستی کی سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
اس بستی کی گلیوں کے ناموں میں نیکی اور بدی کے نام نہیں
سیدھے سادے نام ہیں جیسے : لالچ، غصہ، بھوک، محبت، نفرت
سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
شہر نہیں ہیں، چاروں جانب شور ہی شور ہے، کیا ہے

گھرے شہروں میں رہنے سے عظمت کا احساس مٹا
لمبے حملوں پر جانے کا، قدرت سے ٹکرانے کا ارمان مٹا
اب آرام ہے شہروں میں ——— انسان مٹا

انیس ناگی

خاموشی کا شہر

ہوا دھند کے پھیلے لب چومتی ہے
کہاں زندگی ہے ؟
کہاں زندگی کے نشاں ہیں کہ تم شہر میں ہو
جہاں ایک ہی روپ ہے جو ہمیشہ رہے گا

اٹھو باؤلے، اب تمھیں کس تمنا نے منزل کا دھوکا دیا ہے
کہ تم سانس کی اوٹ میں چپ کھڑے سوچتے ہو
یہاں ہر نفس بے صدا ہے
یہاں ہر گھڑی اب سسکتی سی زنجیر
ہر اک دفا تیرگی کا ستوں ہے
چلو خواہشیں ڈھونڈنے،
بن سنور کے چلو خواہشیں ڈھونڈنی ہیں
نہیں تو یہی خامشی بھوت بن کر
گھروں کے کواڑوں کے پیچھے ہمیشہ ڈراتی رہے گی

گوہر نوشاہی

سانپ آکاٹ مجھے

سانپ آ کاٹ مجھے ایڑی پر
میں تجھے دانۂ گندم کی قسم دیتا ہوں
شہر کے اونچے مکانوں پہ چمکتا سورج
مجھ سے کہتا ہے کہ تو ننگا ہے
اور مری روح مجھے کہتی ہے :
جسم کو ڈھانک، مری شہر میں تذلیل نہ کر
مجھ کو احساس ہے میں ننگا ہوں
صبح کے نور کے مانند مجھے
کوئی ملبوس ازل سے نہ ملا
سبز پتوں نے سہارا نہ دیا

سانپ! آکاٹ مجھے
بخش دے موت کا ملبوس مجھے
دیکھ اب جسم مرا
دن کی گرمی سے جھلستا ہے کبھی
اور پھر رات کی سردی سے ٹھٹھرتا ہے کبھی
اور مری روح مجھے کہتی ہے :
جسم کو ڈھانک، مری شہر میں تذلیل نہ کر

سانپ! آکاٹ مجھے ایڑی پر

اور مرے جسم کو گھلتا ہوا اتنا نیا کر دے
صبح کا نور جسے دیکھ کے شرما جائے
اور مری روح کہے :
اب تجھے موت نہیں آئے گی
میں تجھے دانۂ گندم کی قسم دیتا ہوں ۔

اسد محمد خاں

نو منزلہ بلڈنگ

زمیں کا رقصِ پیہم، سرد لوہے کی کیلی کیل، زنجیرِ کشش، شانے
اور اک نو منزلہ بلڈنگ
اور اس نو منزلہ بلڈنگ کو اپنے ناتواں شانوں کی باقی ماندہ قوت سے سنبھالے
اس فسردہ شہر کی سب سے بڑی فٹ پاتھ پر ٹانگیں پسارے
ہر گزرتے واہمے کو تکنے والا —— میں

یہ برفیلی ہوا تھی یا کوئی لمحہ
سبا رفتار لمحہ، برق دم لمحہ
جو میری انگلیوں کے درمیاں سے خواب کی مانند گزرا ——
کیا مرورِ وقت جاری ہے —— ؟

مرے لاغر بدن میں کون ناخن گاڑتا ہے ؟
کیوں زمیں پیخ بستہ زنبوروں میں میرے پاؤں جکڑے ہے
میں آخر کون ہوں ؟ —— میں کون ہوں ؟ —— اور نام .....
میرا نام کیا ہے ؟ کیا میں زندہ ہوں —— ؟

میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں —— میں اپنی چیخ سُن سکتا ہوں
"اک پل کے لیے ٹھہرو، بس اک پل کے لیے ٹھہرو
کہ اس نو منزلہ بلڈنگ سے اپنے ناتواں شانوں کو میں آزاد تو کرلوں"

میں کہتا ہوں ـــــ میں سنتا ہوں
مگر وہ گر بہ پا لمحہ ہوا کے دوش پر اُڑتا چلا جاتا ہے . . . . یہ نومنزلہ بلڈنگ

مرے مالک میں تنہا ہوں ـــــ میں تنہا ہوں
مری جانب بڑے بے رحم سناٹوں میں لپٹی شام بڑھتی آرہی ہے، میں گراجاتا ہوں
بولو ! کیا میں لمحوں کی ابابیلیں اپنی مٹھی میں جکڑ لوں ؟
کیا میں اس نومنزلہ بلڈنگ کو اپنے ناتواں شانوں سے نیچے پھینک دوں
اٹھ کر کھڑا ہوجاؤں ؟
مگر میں نے . . . . .
مگر میں نے تو اس نومنزلہ بلڈنگ کی خاطر ناخنوں سے نیو کھودی تھی ۔

احمد ہمیش

پرچھائیں کا سفر

یہ سچ ہے کہ ہاتھوں میں ترسول تھامے
براگی تھیں تھے
کھلے آسمان کو تھیں تک رہے تھے
ہزاروں برس تک تھیں دیوتوں نے کچھ نہ دیا ۔۔ اس جزیرے سے تم لوٹ آئے
اُسی دم پُرانے سمندر کے کونے میں، مونگے ۔ چٹانیں بناتے ہوئے تھک گئے تھے ۔۔
انھیں مچھلیاں کھا گئی تھیں
انیکوں بنوں، اپوتوں سے گزرتی ہوئی، دوڑتی سنسناہٹ انھیں ڈھونڈ نے
جا رہی تھی

زمیں ایک چکر لگا کے رُکی تھی
کہ تم لوٹ آئے
اور پھر بھیک مانگی ہوئی سیپیوں، سرد گھونگھوں سے تم نے کئی سر پھرے
بُت بنائے

مگر اب کہاں ہو
سرشٹی کہاں ہے!
یہاں ایک کمرے میں بجلی کے کالے پلنگ کی چمکتی لکیروں سے دو جھانکتے گول سوراخ ۔۔
اور تاک میں گیت بیٹھی ہوئی موت کی بھوک، لالچ، ہوا میں سلگتی ہوئی سوکھتی ترشنا
کون ہے ۔۔ روشنی ۔۔ نہیں پیپ کے ڈھیر میں ایک لتھڑی ہوئی ڈوبتی کھوپڑی
دو نشان ملگجے ۔۔ ایک ابلا کہانی کے پیچھے بھٹکتے ہوئے سرد سونے سفر کی بکتی ہنسی
کون سوچے ۔۔ گلاب اور جوہی کے پھولوں کی مہکار، رستے سے ہٹ کے پرانی
ہوئی، بجھ گئی
اک زمانہ کنارے کی گھٹناؤں کا ساتھ دیتا، برکھوں سے گرتی ہوئی پتیوں کو سمیٹے

بہاؤ سے ڈرتے ہوئے آخری جل میں بہتا چلا جا رہا ہے
سنو ـــــ آخری جل تمھارا نہیں ہے، کسی کا نہیں ہے ---- !
وشاؤں کے بہروپ، اب ہارتے، ہانپتے، ٹوٹتے جا رہے ہیں
انھیں اتنا مردہ سمجھ لو کر دیکھے بنا چل پڑو اور چلتے رہو
جنھیں تم کہیں بھول سے وقت کے موڑ پر چھوڑ آئے
وہ اب جا چکے ہیں،
انھیں مت بلاؤ،
یہاں ایک کمرے کی کھڑکی میں بیٹھے ہوئے سوچتے ہو کہ آنکھیں تمھاری ہیں ـــــ
رچنا تمھاری
اُدھر مڑ کے دیکھو، بنائے ہوئے ان گنت رنگ
شبدوں کے سانچوں میں ڈھالی ہوئی اپسرائیں، نئے فرش پر ڈگمگاتی ہوئی
گر پڑی ہیں
سویرے کی نیلاہٹیں، گندگی میں لپیٹی ہوئی چھاؤں میں اونگھتی ہیں
فقط مکھیاں اُڑ رہی ہیں۔

نذیر احمد ناجی

اتوار

آج یہ سوچ کے اٹھا ہوں
آج نہ کوئی آہ بھروں
آج نہ کوئی فکر کروں
آج کے دن کچھ ننھی ننھی خوشیوں کی تخلیق کروں

اُلٹا دو آئینے کو
میری ساری تصویروں کو
میرے سینے پر رکھ دو
بند دریچے کھول کے
صبح کے سورج کی کرنوں کو
کمرے کی تاریکی سے
اک سرگوشی کر لینے دو
مدّت سے اس تاریکی کی
آگ میں جلتا آیا ہوں
کل بھی جلتے رہنا ہے
کل بھی یہی کچھ سہنا ہے
لیکن آج کسی لمحے پر
غم کا سایہ بھی نہ پڑے
آج بس اُس کے خط

اپنی تصویریں،
غالبؔ، میرؔ کے شعر
چائے، سگریٹ اور کچھ تازہ پھول
ان کے سوا ہر شے کو
رات کی باقی مے کے چھینٹے دے کر
آگ کا شعلہ دکھلا دو
اس وقفے میں جو بھی نئے غم
دنیا پر نازل ہوں گے
کل اخبار میں پڑھ لوں گا۔

محبوب خزاں

اکیلی بستیاں

بےکس تپلی، بچھولے اکیلی، آہیں بھرے دل جلی
بھوری پہاڑی، خاکی فصیلیں، دھانی کبھی سانولی
جنگل میں رستے، رستوں میں پتھر، پتھر پہ نیلم پری
لہریلی سڑکیں، چلتے مناظر، بکھری ہوئی زندگی
بادل، چٹانیں، مخمل کے پردے، پردوں پہ لہریں پڑی
کاکل پہ کاکل، خیموں پہ خیمے، سلوٹ پہ سلوٹ ہری
بستی میں گندی گلیوں کے زینے، لڑکے دھما چوکڑی
برسے تو چھاگل، ٹھہرے تو ہلچل، راہوں میں اک کھلبلی
گرتے گھروندے، اُٹھتی امنگیں، ہاتھوں میں گاگر بھری
کانوں میں بالے، چاندی کے ہالے، پلکیں گھنی کھردری
ٹھڈی پہ پہرے، چہروں پہ آنکھیں، آئی جوانی چلی
ٹیلوں پہ جوبن، ریوڑ کے ریوڑ، کھیتوں پہ جھالر چڑھی
وادی میں بھیگے روڑوں کی پیٹی، چشموں کی چمپ کلی
سانچے نئے اور باتیں پرانی، مٹی کی جادوگری۔

صلاح الدین محمد

دروغ گو راوی

دل دروغ گو راوی
فاصلے بلا کے ہیں
پیرہن کے پیرائے
جسم کی پرستش میں
جستجو محبت کی
خود فریب خواہش میں

دل دروغ گو راوی
فاصلے بلا کے ہیں
پیکرِ وفا کس نے
جسم سے تراشا ہے
زلف و عارض و لب ہیں
پیار کا تماشا ہے
داغِ دل کا سرمایہ
کس نے کس کو اپنایا۔

اعجاز فاروقی

احیا

عصائے موسیٰ
اندھیری راتوں کی ایک تجسیم منجمد
جس میں حال ایک نقطۂ سکون
نہ کوئی حرکت، نہ کوئی رفتار
جب آسمانوں سے آگ برسی
تو برف پگھلی
دھواں سا نکلا
عصا میں حرکت ہوئی
تو محبوس ناگ نکلا
وہ ایک سیال نور
جو منجمد پڑا تھا
بڑھا
جھپٹ کر
خزاں رسیدہ شجر کی سب خشک ٹہنیوں کو نگل گیا

فہمیدہ ریاض

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچّے کے دل کا دھڑکنا سنو
ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟
بس۔ یہیں چھوڑ دو
تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو
میرے بے کل نفس کو قرار آ گیا
میرے عیسیٰ! مرے درد کے چارہ گر
میرا ہر موئے تن
اس ہتھیلی سے تسکین پانے لگا
اس ہتھیلی کے نیچے مرا لال کروٹ سی لینے لگا
انگلیوں سے بدن اس کا پہچان لو
تم اسے جان لو
چومنے دو مجھے اپنی یہ انگلیاں
اس کی ہر پور کو چومنے دو مجھے
ناخنوں کو لبوں سے لگا لوں ذرا
اس ہتھیلی میں منھ تو چھپا لوں ذرا

پھول لاتی ہوئی یہ ہری اُنگلیاں
میری آنکھوں سے آنسو اُبلتے ہوئے
ان سے سینچوں گی میں
پھول لاتی ہوئی انگلیوں کی جڑیں
چومنے دو مجھے، اپنے بال، اپنے ماتھے کا چاند، اپنے لب
یہ چمکتی ہوئی کالی آنکھیں
مسکراتی یہ حیران آنکھیں
مرے کانپتے ہونٹ، میری چھلکتی ہوئی آنکھ کو
دیکھ کر کتنی حیران ہیں

تم کو معلوم کیا ــــ تم کو معلوم کیا
تم نے جانے مجھے کیا سے کیا کر دیا
میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
یا کراں تا کراں ایک انمٹ خلا
یوں ہی پھرتی تھی میں
زیست کے ذائقے کو ترستی ہوئی
دل میں آنسو بھرے سب پہ ہنستی ہوئی
تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا
پھوٹتی ہے مرے جسم سے روشنی

سب مقدس کتابیں جو نازل ہوئیں
سب پیمبر جو اب تک اُتارے گئے
سب فرشتے کہ ہیں بادلوں سے پرے
رنگ، سنگیت، سر، پھول، کلیاں، شجر
صبحدم پیڑ کی جھولتی ڈالیاں

ان کے مفہوم جو بھی بتائے گئے
خاک پر بسنے والے بشر کو مسرت کے جتنے بھی نغمے سنائے گئے
سب رشی، سب منی، انبیا، اولیا
خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، خدا
آج سب پر مجھے
اعتبار آگیا — اعتبار آگیا

ناهید ثانی

ایک عجیب کردار

عجیب تھا وہ
جو خواہشوں کے ہزار محلوں کو سرنگوں کر کے
ریل کی پٹریوں کو مقصد بنا رہا تھا
عجیب تھا وہ
جو راہ کی مستقیم سطروں کو دائروں میں بدل رہا تھا
عجیب تھا وہ
جو آنکھ کی قوتوں کو معکوس راستوں پر چلا رہا تھا
جو ذات کے بے کراں سمندر کی شورشوں میں
سکون و آسودگی کے جوہر کو پا رہا تھا
عجیب تھا وہ
جو جبر کی اور مسرتوں کی ہزار کیفیتوں کو اپنے
وجود کا اک حسین نغمہ بنا رہا تھا
عجیب تھا وہ
جو سب کو تج کر
مکان اور لامکاں کی پنہائیوں کو مسلک بنا رہا تھا
عجیب تھا وہ .....

شمس الرحمٰن فاروقی

شیشۂ ساعت کا غبار

میں زندہ تھا
مگر میں تیرے سرخ، نیلگوں، سفید بلبلے میں قید تھا
ہوا وسیع تھی، مگر حدود سے رہا نہ تھی
نہ میرے پر شکستہ تھے نہ میری سانس کم
تھا بلبلے کی کائنات میں مرا ہی دم قدم
مگر مری اُڑان سُرخ نیلگوں سفید مقبرے کے
آخری خطوط سے سوا نہ تھی
میں حال کے اتھاہ پانیوں میں غرق
یا گذشتہ وقت کے بھنور کے دست آتشیں میں ایک صید زرد تھا

تو میں نے کیا کیا
کہ اپنی سانس روک کر کے، آنکھیں بیچ کر کے، سر کو آگے کر کے
شانوں کو جھٹک کے
ایک جست میں ہی جنت کی سی سرد چھت کو توڑ کر
میں اس کے پار ہو گیا،
طلسم سے صدا اٹھی: "ہمیں شکست ہو گئی ....
شکست ہو گئی .... کست ہو گئی .... است ہو گئی .....
.... ت ہو گئی ..... ہو گئی ...."

شب برات،
آتشیں تماشوں کا سماں

اٹھا کے میری پچھیوں نے ناگہاں
پچاس پیسے کے انار کے لبوں پہ ایک قطرۂ نار رکھ دی،
خاک کو یہ گرم بوسہ کب نصیب تھا!

انار میں جو قید تھا، جو ذرہ ذرہ صید تھا
وہ جن ابل پڑا
سیاہیاں سفید، سرخ نیلگوں طیور سے چمک اٹھیں
مگر نہ جانے پھر کدھر طیور اڑ گئے
انار کو شب برات نے ندی میں دفن کر دیا
صدائے بازگشت قطرہ قطرہ کنکروں کی طرح غرق ہو گئی

طلسم رہ گیا — مگر طلسم میں جو قید تھا
وہ اس صدا کے ساتھ کھو گیا۔

مصنف ۔ اقبال توصیفی

مراجعت

میں اپنے جسم کے باہر کھڑا ہوں

ان آنکھوں کے دریچے سے تو اب
بسیں، سڑکیں، ملوں کی چمنیاں
میونسپلٹی کا وہ نل، کوڑھی بھکاری
دھنی مل کا بہت اونچا مکاں
کچھ بھی نظر آتا نہیں

اب ان آنکھوں میں میری
ہزاروں انجنوں کا شور ہے
کالا دھواں ہے
مگر دل کو بھاتا ہے ابھی تک
نیلگوں دوری کا منظر
چاند، تارے، آسماں
دیکھنے کی خواہشیں
جاگتی ہیں
مشینی ہاتھ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں

میں اپنے جسم کے باہر کھڑا ہوں

ایک پُرانی نظم

کچھ نہیں جانتا
کس طرح آ گیا
میں ہوا کے بھیانک طلسمات میں
کوکھ سے جن کی تولید پاتے ہیں بالشتیے
روز و شب، ہر گھڑی
مجھ میں در آتے ہیں، بے اجازت
کھلی دیکھ کر کھڑکیاں اور در

موت اور زندگی ان کا اک کھیل ہے
کیونکہ ہر ایک بالشتیہ
موت سے قبل جاں سونپ جاتا ہے
اپنے کسی جانشیں (دوسرے) کو
دوسرا، تیسرے
اور پھر تیسرا چوتھے بالشتیے کو
اس طرح مرتے جیتے نراکار بالشتیوں اور ان کے
طلسمات کا سلسلہ
جنم سے آج تک سوچتا آ رہا ہوں
کتنا مجبور ہوں، چاہتا ہوں
مگر ان طلسمات کا انت میں دیکھ سکتا نہیں
.... اور اَن دیکھے بھی ان کا سرِ خفی مجھ کو معلوم ہے

اِن طلسمات کا ایک قیدی ہوں میں
ان سے بچھڑا تو لاریب مر جاؤں گا
یہ جو بکھرے تو میں خود بکھر جاؤں گا
..... اور پھر اپنا منھ کھول کر
مجھ کو سالم نگل جائے گی
ایک ڈائن —— (زمیں)

ریاض مجید

سفرنامہ

فدا-ک کے تصور کو گھروں میں چھوڑ کر تنہا
سنی باتوں کو خود محسوس کرنے، دیکھنے کے تجربے کے واسطے
تپتی زمینوں اور یخ بستہ پہاڑوں کی طرف نکلے
نئے کو دیکھنے کے شوق سے سرشار دو آنکھیں
تجسس سے بھرا اک دل
یہی زادِ سفر جانا
تمنا تھی تو یہ، دیکھیں زمیں آب و ہوا کے فرق سے کیسے بدلتی ہے
زبانوں اور لہجوں کے تفاوت سے یہ دنیا کس قدر رنگوں میں بستی ہے
اشاروں کی زباں کتنی مکمل ہے،
تمنا تھی تو یہ، دیکھیں نئے چہروں میں کتنی ان چکھی لذت ہے؟

وطن چھوڑے برس گزرے
افق چھونے کی کوشش میں
گزرتے موسموں کے تھپڑے سے گھائل بدن سنولا گئے
لیکن سفر تقدیر بن کر آج بھی ہاتھوں پہ لکھا ہے
ہمارے پاؤں میں کتنی زمینوں کی مسافت کی تھکن ہے
مگر اب تک سفر کا شوق جسموں میں لہو کے ساتھ گردش کر رہا ہے
ہمارے حلق کتنے پانیوں کے ذائقے سے
آشنا ہو کر بھی کیسے خشک ہیں

بہت کچھ دیکھ کر بھی اور بہت کچھ دیکھنے کی آرزو سے چین رکھتی ہے

جہاں کی سیر پر نکلے مسافر بھی ہواؤں کی طرح بوڑھے نہیں ہوتے
زمیں جب تک ہمارے واسطے اک بھید ہے
بڑھتے چلو یارو
ٹھہرنا موت ہے اور چلتے رہنا ہی ہماری زندگی ہے

خوشنویس: ایس، ایم، منظر

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

معیاری ادب کا سلسلہ

انتہائی صحت متن اور ضروری اعراب و فرہنگ کے ساتھ نوٹو آفسیٹ کے ذریعے چھپی ہوئی معیاری ادب کی اہم اور نادر کتابیں۔ ان کتابوں کو مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں و کشمیر کے گراں قدر تعاون سے از سرِ نو مرتب کرنے کا اور کم سے کم قیمت پر فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ محققین اور طلبہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ الطاف حسین حالی مرتبہ: رشید حسن خاں

مقدمہ شعر و شاعری کا شمار اردو کی ان اہم اور معیاری کتابوں میں ہے جن کی اہمیت، افادیت اور مقبولیت پر شاید ہی کبھی آنچ آسکے۔ آج بھی جبکہ اردو میں تنقید کا سرمایہ بہت بڑھ چکا ہے، اس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۶۰ لائبریری اڈیشن ۳/۴۰

انتخابِ سراج اورنگ آبادی مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

اس انتخابِ کلام میں آپ کو ایک ایسی جمال پرست اور بے قرار شخصیت کی جھلکیاں ملیں گی جو ذات و کائنات کے عرفان کی تلاش میں ہے۔ ان اشعار میں ایک دردمند کی آواز بھی ہے اور ایک تہذیب اور ایک تاریخی دور کی صدا بھی۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۱/۲۰ لائبریری اڈیشن ۱/۷۰

موازنۂ انیس و دبیر شبلی نعمانی مرتبہ: رشید حسن خاں

موازنۂ انیس و دبیر اردو میں تنقید کی ابتدائی اور اہم کتابوں میں سے ہے۔ یہ اپنے انداز کی ایک ایسی منفرد تصنیف ہے کہ اگر اسے انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات کا جائزہ اور ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے تعین کی دستاویز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۳/۲۵ لائبریری اڈیشن ۴/۲۵

انتخابِ مراثی (انیس و دبیر) مرتبہ: رشید حسن خاں

مرثیہ نگاروں کی طویل فہرست میں انیس و دبیر کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ انیس کے

یہاں منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کا کمال نظر آتا ہے اور دبیر کے یہاں تشبیہات و استعارات کی جدت، عربی و فارسی کے پُرشوکت الفاظ کا استعمال اور پُرشکوہ طرزِ بیان، اُن کے مراثی کی خصوصیات ہیں۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۳/- لائبریری اڈیشن ۴/-

انتخابِ نظیر اکبرآبادی

مرتبہ: رشید حسن خاں

نظیر ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے زمانے میں بھی مشہور تھے اور آج بھی مشہور ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ اُس زمانے میں ان کا کلام صرف عام لوگوں کی زبان پر تھا لیکن آج خواص بھی ان کی شاعرانہ ہمہ گیریوں کے معترف ہیں۔ ان کے کلام کا یہ انتخاب اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ ان کی اہم ترین نظمیں مکمل یا جزوی انتخاب کے ساتھ یکجا ہو جائیں۔ آخر میں غزلوں کا انتخاب ہے اور ضروری الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی گئی ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۳/۴۵ لائبریری اڈیشن ۴/۴۰

نیرنگِ خیال (حصہ اوّل و دوم) مولانا محمد حسین آزاد

مرتبہ: مالک رام

نیرنگِ خیال، مولانا آزاد کے معرکتہ الآرا مضامین کا مجموعہ ہے جسے معتبر ترین نسخے کی بنیاد پر انتہائی صحتِ متن کے ساتھ اس اڈیشن کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ طلبہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۱/۹۰ لائبریری اڈیشن ۲/۳۰

فسانۂ آزاد (تلخیص) رتن ناتھ سرشار

مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس

'فسانۂ آزاد' سرشار کا وہ گراں قدر کارنامہ ہے جس میں نوابی عہد کے لکھنؤ کی انحطاط پذیر معاشرت، اس کی اچھوتی ظرافت اور لکھنؤ کی بامحاورہ ٹکسالی زبان اور بولی ٹھولی کے فن کارانہ استعمال کو سرشار کے کمالِ فن کا جوہر کہا گیا ہے۔

چونکہ موجودہ حالات میں اتنی ضخیم کتاب کو شائع کرنا آسان کام نہیں اس لیے اس کی کامیاب تلخیص شائع کی گئی تاکہ عوام کی دسترس سے باہر نہ رہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۶/۲۰ لائبریری اڈیشن ۷/۵۰

فردوسِ بریں — عبدالحلیم شرر — مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

مولانا شرر کے ناولوں میں "فردوسِ بریں" کو فنی تکمیل کے اعتبار سے کامل ترین ناول کہا گیا ہے۔ اس کی منظر نگاری اور ماحول کشی میں شرر کی صناعی درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۱۰ لائبریری اڈیشن ۲/۹۰

شریف زادہ — مرزا رسوا — مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس

اردو کے منفرد ادیب اور ناول نگار مرزا رسوا کا دوسرا اہم ناول۔ اس ناول کا شمار اردو کے ان چند ناولوں میں کیا جاتا ہے جس نے دورِ حاضر کے اردو خواں نوجوانوں کی سیرت کو متاثر کیا ہے۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۵۰ لائبریری اڈیشن ۳/-

حیاتِ سعدی — الطاف حسین حالی — مرتبہ: رشید حسن خاں

کلامِ سعدی میں جو ادبی نکات بکھرے ہوئے ہیں ان کی دیدہ ورانہ تفصیل و توضیح اس کتاب میں محفوظ کر لی گئی ہے۔ یہ کتاب ہمیشہ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۳/۲۵ لائبریری اڈیشن ۴/-

انتخابِ اکبر الٰہ آبادی — مرتبہ: ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی

اکبر کے ہاں ہمیں پہلی مرتبہ طنز و مزاح دونوں، شاعر کی ذات کی تنگ اور محدود دنیا سے بلند نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ محض اندازِ بیان ہی نہیں، سماجی تبدیلیوں کے سمجھنے اور سمجھانے کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ ان کے کلام میں ہنسوڑپن کے ساتھ ہی سنجیدگی، شائستگی اور غور و فکر کی فضا بھی پائی جاتی ہے۔ قیمت طلبہ اڈیشن ۲/- لائبریری اڈیشن ۲/۵۰

انتخابِ میر — میر تقی میر — مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

امام المتغزلین میر کی زبان کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی ہے۔ ان کا ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ ان کی غزلیں تو بالخصوص کمالِ فن کی آئینہ دار ہیں۔ میر کے کلام کا یہ انتخاب بڑی تحقیق و جستجو اور دیدہ ریزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۳/۱۰
لائبریری اڈیشن ۴/۵۰

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

۱۹۵۷ء میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے نام سے ایک بڑے اور خود مختار اشاعتی ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ اس ادارے کا اولین مقصد ملک میں ایک ایسی ہمہ گیر تحریک چلانا تھا جس کے ذریعے ہندوستان کے عوام میں کتابیں پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کیا جائے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کو اپنے اس مقصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ یہ ادارہ اب تک پانچ سو سے زیادہ کتابیں ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں شائع کر چکا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل کتابیں اردو میں شائع کی گئی ہیں

آبادی	مصنفہ ڈاکٹر ایس اگروال	ترجمہ، مخمور جالندھری	۵/۲۵
اکبر	" لارنس بنیس	" رضیہ سجاد ظہیر	۳/۵۰
پنڈت وشنو دگمبر	" وی آر اٹھاولے	" ش۔ قدوائی	۲/۲۵
عظیم باغی	" ڈینس کنکیڈ	" ڈاکٹر پرماتما سرن	۶/۲۵
قاضی نذرالاسلام	" بسودھا چکرورتی	" عرش ملسیانی	۲/۲۵
کبیر	" ڈاکٹر پارس ناتھ تیواری	" ایم، کے، درانی	۲/۲۵
کچھوا اور خرگوش	" ڈاکٹر ذاکر حسین	بلا مجلد ۱/۰ مجلد	۲/۰
گاندھی کا ہندستان: کثرت میں وحدت		مرتبہ، نیشنل گاندھی صدی سب کمیٹی	۲/۲۵
گرو نانک	مصنفہ گوپال سنگھ	ترجمہ، مخمور جالندھری	۳/۲۵
مٹی بنتی تصویریں	" بھگوتی چرن ورما	" رضیہ سجاد ظہیر	۵/۰
تاش کے محل (ناول)	میال رنگنا یکما	" زینت ساجدہ	۵/۵۰
تامل افسانے	مرتبہ، می پا سوم' سندرم	" حسرت سہروردی	۸/۰
سفید خون (ناول)	مصنفہ نانک سنگھ	" رتن سنگھ	۸/۰
گرو گوبند سنگھ	" ڈاکٹر گوپال سنگھ	" مخمور جالندھری	۳/۰
ہندی افسانے	مرتبہ (ڈاکٹر) نامور سنگھ	" اگرسین نارنگ	۹/۰
زندگی ایک ناٹک (ناول)	مصنفہ پنالال پٹیل	" کشور سلطانہ	۱۰/۰
پنجابی افسانے	مرتبہ ہربھجن سنگھ	" مخمور جالندھری	۴/۰
رنجیت سنگھ	مصنفہ ڈی۔ آر۔ سود	" " "	۲/۵۰

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی ۲۵، دلی ۶، بمبئی ۳ اور علی گڑھ ۲

دیوانِ درد   میر درد   مرتبہ: رشید حسن خاں

میر کے علاوہ خواجہ میر درد اپنے عہد کے باقی تمام غزل گو شعرا سے بلند ہیں بلکہ بلند تر۔ حیرت و حسرت کا ناتمام سا اظہار ان کے اچھے اشعار کا عام جوہر ہے اور ایسے شعر بھی تاثیر سے معمور ہیں جن میں عشقیہ جذبات اور تصوف کی مادرائیت یکجا ہو کر نمایاں ہوئی ہے۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۷۵ لائبریری اڈیشن ۳/۳۰

مجالس النسا   حالی   مرتبہ: صالحہ عابد حسین

مولانا حالی کا مقصدی ناول جس میں نہ تو واعظانہ خشکی ہے، نہ نصیحت کی تلخی۔ یہ ناول خاص طور عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ سادہ دل نشین اندازِ بیان۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۵۰ لائبریری اڈیشن ۳/-

انتخاب مضامین شبلی   مرتبہ: رشید حسن خاں

مولانا شبلی کے مضامین میں ان کی وسعتِ نظر کے عنوانات بکھرے ہوئے ہیں۔ اس انتخاب میں ادبی اور تنقیدی مضامین، کتابوں کے تبصرے، تحقیقی مضامین اور اسلامیات اور قرآن پاک سے متعلق پچیس اہم مضامین ہیں جن میں نقد و نظر، علم و بصیرت اور انشا پردازی کے بہترین جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۷/- لائبریری اڈیشن ۸/۵۰

امراؤ جان ادا   مرزا محمد ہادی رسوا   مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

لکھنؤ کی تہذیب کے پس منظر میں امراؤ جان ادا کی کہانی جس کو مرزا رسوا نے لاثانی نفسیاتی ناول کا جامہ پہنایا تھا۔ اب اس ناول کو ڈاکٹر محمد حسن نے مستند و معتبر نسخوں کی مدد سے از سرِ نو ترتیب دیا ہے اور مکتبہ جامعہ نے نہایت اہتمام سے فوٹو آفسیٹ کے ذریعے شایع کیا ہے۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۶/- لائبریری اڈیشن ۷/۵۰

یادگارِ غالب (حصہ اردو فارسی)   الطاف حسین حالی   مرتبہ: مالک رام

انگریزی خیالات اور طرزِ فکر سے واقف ہونے کے بعد حالی نے محسوس کیا کہ ہماری شاعری نہ صرف جامد اور غیر ترقی پذیر ہے بلکہ غیر فطری بھی۔ اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اپنے انھیں نظریات کا انھوں نے "یادگارِ غالب" میں مرزا کے کلام پر اطلاق کر کے دکھایا کہ

کس طرح کا کلام صحیح شاعری کی تعریف میں آتا ہے اور ملک و ملت کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

قیمت (حصۂ اُردو) طلبہ اڈیشن ۵/۵۰ لائبریری اڈیشن ۶/۵۰

" (حصۂ فارسی) " ۶/۵۰ " ۸/-

مثنوی گلزارِ نسیم — پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی — تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں

مثنوی گلزارِ نسیم، اُردو کی اُن چند مثنویوں میں سے ہے جنھوں نے قبولِ عام کی سند حاصل کی۔ اس کے حسنِ قبول میں اس کی چُست بندشوں کا بڑا حصّہ ہے۔ لفظوں میں ایسی رعایتوں کو ملحوظ رکھنا جن سے معنویت کی تہیں نمایاں ہوتی رہیں، اور بندش کا اس قدر چست ہونا کہ شعر کی روانی تلوار کی کاٹ بن جائے، نسیم کا ہی حصّہ ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۵۰ لائبریری اڈیشن ۳/-

گذشتہ لکھنؤ — عبدالحلیم شرر — تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں

لکھنؤ کی معاشرت میں تراش خراش، نفاست، شائستگی اور ادب و آداب کی ایسی چمک دمک تھی جو آنکھوں میں عکس چھوڑ گئی ہے۔ "گذشتہ لکھنؤ" اسی محفلِ طرب کی داستان ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شرر نے اسے بے حد جذبات نگاری کے ساتھ، ڈوب کر بیان کیا ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۸/۵۰ لائبریری اڈیشن ۱۰/-

فسانۂ مبتلا — ڈپٹی نذیر احمد — تصحیح و ترتیب: ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی

نذیر احمد کے ناولوں میں "مشترکہ خاندان" کی حیثیت بنیادی ہے۔ زیرِ نظر ناول کا ہیرو مبتلا بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو خاندانی بندھنوں میں پھنسا ہوا ہے مگر اس کی فطرت اسے ان سے نکلنے پر اکساتی ہے۔ وہاں سے نکلنا اس کی تقدیر میں نہیں اور فطرت کو کچلنا اس کے بس میں نہیں۔ چنانچہ وہ ایک المیے کا ہیرو بن کر رہ جاتا ہے۔ تعددِ ازدواج کی مخالفت میں لکھا گیا ایک بامقصد ناول۔ قیمت: طلبہ اڈیشن ۵/- لائبریری اڈیشن ۶/-

انتخابِ ولی — تصحیح و ترتیب: ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

ولی فارسی زبان و ادب میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ لہٰذا زبان و ادب کی نزاکتوں اور لطافتوں سے ایک ماہرِ فن کی طرح واقف تھا۔ اس نے اردو زبان و ادب میں وسعت پیدا

کرنے کے لیے فارسی شاعری کے تمام رچاؤ کو کام میں لیا اور غزل کے موضوعات اور روایات کو اس خوبی سے برتا کہ اُردو شاعری کی فضا اور طرزِ تخیل بدل گئی۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۲/۵۰ لائبریری اڈیشن ۳/-

افاداتِ سلیم مولانا وحید الدین سلیم تصحیح و ترتیب: ڈاکٹر خلیق انجم

سلیم مولوی تھے، شاعر تھے، نقاد تھے، صحافی تھے، مترجم تھے اور ماہرِ لسانیات تھے، سچ تو یہ ہے کہ مولانا سلیم اُردو کے پہلے ماہرِ لسانیات ہیں جنھوں نے اُردو زبان کے مسئلے کو صحیح پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ "افاداتِ سلیم" آپ کے چیدہ چیدہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ جسے اُردو ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۵/۵۰ لائبریری اڈیشن ۶/۲۵

توبۃ النصوح شمس العلما مولوی ڈپٹی نذیر احمد تصحیح و ترتیب: مالک رام

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار سرسید کے نورتنوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی، وہ عربی، فارسی کے منتہی تھے، عالمِ دین تھے۔ فقیہہ و متکلم تھے۔ مترجم قرآن تھے، بلند پایہ خطیب و مقرر تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اُردو کے پہلے ناول نگار تھے۔

"توبۃ النصوح" آپ کے دوسرے ناولوں کی طرح اصلاحی ناول ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۴/۵۰ لائبریری اڈیشن ۵/۵۰

قصۂ حاتم طائی حیدر بخش حیدری تصحیح و ترتیب: اطہر پرویز

موسوم بہ آرائشِ محفل

اس کتاب میں حاتم طائی کی سات سیروں کا ذکر ہے۔ زبان و بیان کا کوئی گوشہ نہیں جس سے وہ اپنے مقصد کو سامنے لانے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں۔ حاتم کا ہر قدم نیکی اور خدا ترسی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ حاتم کے علاوہ بھی پڑھنے والے کا سابقہ جن جن کرداروں سے ہوتا ہے ان کا ہر عمل نیکی کے جذبات و احساسات کا حامل

تاریخ ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۶/- لائبریری اڈیشن ۷/-

انتخابِ ناسخ

تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں

ناسخ، دبستانِ لکھنؤ کے سب سے پہلے اور سب سے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی تھی، جس نے دبستانی اسلوب کی حیثیت سے فروغ پایا اور مدت تک غزل پر اپنے نشانات کو نمایاں رکھا۔

اس کتاب کے "تعارف" میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ ناسخ کی شاعری، اور اُن سے منسوب اصلاحِ زبان کے مسائل پر اس طرح گفتگو کی جائے کہ مبہم باتیں روشن ہو سکیں اور مفروضات کا دھندلکا صاف ہو۔ یہ "تعارف" آیندہ مفصل بحثوں کے لیے اہم اشاریے کا کام دے سکتا ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۶/۵۰ لائبریری اڈیشن ۷/۵۰

انتخابِ سودا

تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں

اس انتخاب کی بنیاد کلامِ سودا کے اُس خطی نسخے پر رکھی گئی ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے اور جس کی کتابت کی تکمیل سودا کی زندگی میں ہوئی تھی۔

اِسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ قصائد کا ہے۔ دوسرا حصہ سماجی شاعری کا۔ تیسرے حصے میں "مضحکات" ہیں اور چوتھے حصے میں غزلیات کا انتخاب اور قطعات شامل ہیں۔ سودا کے کلام کا اس قدر مفصل انتخاب، جو ایک نہایت معتبر خطی نسخے پر مبنی ہو، غالباً پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔ آخر میں مفصل فرہنگ بھی شامل کی گئی ہے۔ ضروری الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں اور اوقاف نگاری کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

قیمت: طلبہ اڈیشن ۱۰/-

" لائبریری اڈیشن ۱۱/۵۰

مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشا

کاروانِ فکر	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۳/۷۵
اردو ایسیز	سید ظہیر الدین مدنی	۳/۵۰
اردو مرثیہ	سید سفارش حسین	۶/۰
بکھرے ورق	سونیتی کمار چٹرجی	۳/۰
پردیسی کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	۲/۷۵
تنقید کیا ہے!	آل احمد سرور	۵/۷۵
غزل سرا (اردو)	مجنوں گورکھپوری	۶/۰
نقدِ اقبال	میکش اکبرآبادی	۴/۲۵
فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ	سید ضمیر حسن دہلوی	۳/۰

تذکرہ، سیرت و شخصیت

تذکرۂ معاصرین	مالک رام	۱۵/۰
پریم چند کے خطوط	مدن گوپال	۶/۵۰
تذکرۂ جگر	محمود علی خاں	۳/۰
قلم کا مزدور	مدن گوپال	۴/۰
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	۶/۰
خنداں	〃	۵/۲۵
ڈاکٹر ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۵/۵۰
داستانِ اشک و خوں	خواجہ غلام السیدین	۱/۲۰
شرابِ کہنہ	رشید نعمانی	۳/۲۵
شہر آشوب	ڈاکٹر نعیم احمد	۷/۲۵

تاریخ، سیاسیات و روداد

امریکہ کے کالے مسلمان	ڈاکٹر مشیر الحق	۲/۰
دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد	مولانا عبدالسلام قدوائی	۳/۲۵
مسلمان اور عصری مسائل	ڈاکٹر عابد حسین	۵/۵۰
کتاب و سنت کے جواہر پارے	ترجمہ، مولانا جلال الدین عملی	۲/۲۵
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	۴/۰
امن کا راستہ	عبدالغفار مدہولی	۳/۰
مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ	طاہر محمود	۴/-
کتاب کی کہانی	سید احسن نقوی	۵۰
پاکستان، اس کا قیام اور ابتدائی حالات	سری پرکاش	۴/۰
تاریخ الامت اوّل	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
〃 دوم	〃	۴/۰
〃 سوم	〃	۲/۷۵
〃 چہارم	〃	۳/۲۵
〃 پنجم	〃	۳/۲۵
〃 ششم	〃	۳/۲۵
〃 ہفتم	〃	۳/
〃 ہشتم	〃	۳/۲۵
کچھ پرانے خط دوم	پنڈت جواہر لال نہرو	۸/۰
ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	۸/۰
یادگار شخصیتیں	پنڈت جواہر لال نہرو	۵/۵۰

سفر نامے

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں	شری پیارے لال	۵/۰
عروسِ نیل	سلطانہ آصف فیضی	۳/۲۵

تعلیم و تربیت

بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۴/۲۵
جامعہ کا طریقہ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۴/۵۰
چند پروجیکٹ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
موجودہ تعلیمی مسائل	عبداللہ ولی بخش قادری	۲/۵۰
ہم کیسے پڑھائیں؟	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳/۵۰

ناول

آدمی کا مقدر	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۱/-
آپس کے گیت	" "	۲/۷۵
ایک تھی انیتا	امرتا پریتم	۳/۲۵
باپ بیٹے	ترجمہ انور عظیم	۵/-
باغ و بہار	میر امن مرتب رشید حسن خاں	۲/۷۵
بیوہ	منشی پریم چند	۲/۷۵
پیار کا موسم	مہندر ناتھ	۳/۵۰
چنار کا پتا	سلطانہ آصف فیضی	۲/۲۵
خیالی پلاؤ	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۱/۷۵
دلدل	" رضیہ سجاد ظہیر	۴/۵۰
دلی کی شام	" بلقیس جہاں	۷/۵۰
ڈنگو	" قرۃ العین حیدر	۲/۲۵
راہِ عمل	صالحہ عابد حسین	۷/۵۰
سات سال	" رضیہ سجاد ظہیر	۵/۲۵
شکستِ ناتمام	" زہرہ سیدین	۲/-
صلاح الدین ایوبی	قاضی عبدالستار	۳/۷۵
گئو دان	منشی پریم چند	۱۱/-
میدانِ عمل	" " "	۸/۵۰

ماں کی کھیتی	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۲/-
یودوکیہ	" "	۱/۷۵

افسانے اور خاکے

بڑی حویلی	مرزا محمود بیگ	۲/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	۶/-
چراغوں کا سفر	رام لعل	۴/-
خیاستان	سجاد حیدر یلدرم	۲/۷۵
کالے صاحب	اوپندر ناتھ اشک	۲/۵۰
کیمیاگر	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
نروان	جیلانی بانو	۴/۷۵
نئی بیماری	مہندر ناتھ	۲/۵۰
واردات	منشی پریم چند	۴/-

ڈرامے

آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	-/۷۵
انجام	" "	۱/۲۵
اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۴/-
آئینۂ ایام	ترجمہ: خلیق احمد	۳/۵۰
پردۂ غفلت	ڈاکٹر عابد حسین	۱/۷۵
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۱/۵۰
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۲/۵۰
سراج الدولہ	ترجمہ: اشفاق حسین	۱/۵۰
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	۱/۲۵
موت پر فتح	جیالال ساز	۱/۲۵
نقشِ آخر	اشتیاق حسین قریشی	۱/۲۵

نظم

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	۶/-
پچھلی رات	فراق گورکھپوری	۷/-

نئی دنیا کو سلام — سردار جعفری — ۷/-

غالب اردو کلام کا انتخاب — پروفیسر محمد مجیب — ۲/۵۰

مثنوی سحرالبیان — مرتب: رشید حسن خاں — ۱/۷۵

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکان اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۵۰/-

آں حضرت — الیاس احمد مجیبی (اردو) — ۶۵/-

" " " (ہندی) — ۶۰/-

پاک کہانیاں (دو حصوں میں) — مقبول احمد سیوہاری — ۲/۳۵

خلفائے اربعہ — خواجہ عبدالحی فاروقی — ۲/۲۵

عقائد اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۵۰/-

مسلمان بیبیاں — " اعجاز الحق قدوسی — ۷۵/-

نبیوں کے قصے — خواجہ عبدالحی فاروقی — ۱/۲۵

ہمارے رسول — " " " — ۱/۶۵

ہمارے نبی — سید نواب علی رضوی (اردو) — ۷۵/-

" " " (ہندی) — ۴۰/-

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد اعظمی — ۱/۷۵

انوکھا عجائب خانہ — محمد حسین حسان (۴ حصے) — ۱/۸۱

بجلی کی کہانی — علی احمد خاں — ۵۰/-

بڑولما کی کہانی — محمد عبدالغفار — ۵۶/-

تاریخ ہند کی کہانیاں (اول) — خجستہ سلطانہ — ۸۰/-

" " (دوم) — ضیاء الرحمٰن — ۱/-

" " (سوم) — مشتاق احمد اعظمی — ۸۰/-

" " (چہارم) " — ۹۵/-

چاند کی کہانی — قمر امین — ۱/۷۵

خبر رسانی کے طریقے — رفیعہ منظور الامین — ۵/۵۰

دنیا کے بچے — محمد حسین حسان — ۱/-

دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی — ۱/۵۰

رابندر ناتھ ٹیگور — صفدر حسین — ۱/۲۵

سماجی زندگی اول — احمد پٹیل و غلام ابراہیم — ۵۱/-

" " دوم " " — ۸۰/-

" " سوم " " — ۸۱/-

" " چہارم " " — ۸۱/-

سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی — ۱/۳۰

سمندر کے نیچے " " — ۲/-

قدرت کے کرشمے — ادارہ — ۶۲/-

میرانیس — محمد حسین حسان — ۱/۲۵

ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چند — ۱/۵۰

کہانیاں، ناول اور ڈرامے

چینی کی گڑیا — محمد حسین حسان ندوی — ۵۰/-

بہادر سیاح " " — ۶۵/-

چچا غالب (مرتبہ) " " — ۱/۷۵

بھیڑیے کے بچے (ترجمہ) — قرۃ العین حیدر — ۵۰/-

ہرن کے بچے " " — ۵۰/-

میاں ڈھینچو کے بچے " " — ۵۰/-

شیر خاں " " — ۵۰/-

لومڑی کے بچے " " — ۵۰/-

بہادر " " — ۷۵/-

سونے کا پنجرہ — احسان الحق — ۹۵/-

بدنصیب شہزادی — ابرار محسن — ۱/-

عقل کا سودا " — ۸۰/-

جنگل کا راجا " — ۱/-

تیس مار خاں	ابرار محسن	۱/-	تین اناڑی	عصمت چغتائی	۱/۲۰
بندر کا گھر	جعفر برنی	۰/۴۵	چقماق کی ڈبیہ	برکت علی فراق	۰/۴۰
دلّی دور ہے	مجیب احمد خاں	۰/۵۰	چپاوت کا آدم خور شیر	محمد حسین	۰/۳۵
جب اور اب	آصفہ مجیب	۱/۷۵	ستاروں کی سیر	کرشن چندر	۱/۷۵
تین کوڑیاں	اقبال امروہوی	۱/۲۰	کوے دادا	ترجمہ مجیب احمد خاں	۱/۷۵
اس نے کیا کر نہ جانا	آصفہ مجیب	۰/۳۷	لال مرغی	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
پریم کی جیت	اسد اللہ کاظمی	۰/۳۷	مزہ چکھائیں گے	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۳۵
تا جمیل خاں	محمد حسین حسان	۰/۳۰	مزیدار پہیلیاں	محمود علی خاں	۰/۶۵
ترکوں کی کہانیاں	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۵	ننھا ٹٹو	خورشیدہ سلطان	۰/۳۰
تیس مار خاں کے کارنامے	م نسیم	۱/۵۰			

ہماری درسی کتابیں

اُردو

نئی کتاب کا قاعدہ	۰/۴۰	اُردو کی چوتھی	۱/۵۰
اُردو کا قاعدہ	۰/۳۵	" " پانچویں	۱/۶۷
" " پہلی	۰/۴۰	" " چھٹی	۱/۷۶
" " دوسری	۰/۹۰	" " ساتویں	۱/۸۲
" " تیسری	۱/۳۵	" " آٹھویں	۱/۸۲

ہندی

سرل ہندی پرائمر	۰/۲۶	بال پریم دوم	۱/-
ہندی پرائمر اوّل	۰/۲۵	" " سوم	۱/۲۵
" " دوم	۰/۲۵	" " چہارم	۱/۲۵
بال پریم اوّل	۱/-	نو پربھات اوّل	۱/۳۷

حساب

جدید حساب (دوسرے درجے کے لیے)	ترجمہ	یاور حسین	۱/۶۵
" " (تیسرے " ")	"	محمد یونس	۱/۸۰
" " (چوتھے " ")	"	ملکہ بیگم قزلباس	۲/۲۵
" " (پانچویں " ")	"	محمد یونس	۲/۲۰

طالبات کے لیے

گھریلو سائنس (تیسری جماعت کے لیے)	ترجمہ	محمود سرورش	۲/۲۵
" " (چوتھی " ")	"	"	۲/۴۵
" " (پانچویں " ")	"	دینا ناتھ گردھر	۲/۹۵

تعلیم بالغان کے سلسلے میں کتابیں

ابتدائی کتاب

بہشتی	مرتبہ ادارہ تعلیم ترقی جامعہ		۰/۳۱
دس سبق	مرتبہ ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ		۰/۲۵
پیارے لال درزی	"	"	۰/۳۱
تانگے والا	"	"	۰/۳۱

پیشے

احمد خاں دوکاندار	"	"	۰/۳۱
حفیظ خانساماں	"	"	۰/۳۱
کلو حلوائی	"	"	۰/۳۱
عبدالرحمٰن راج	"	"	۰/۳۱
مرغی پالیے	"	"	۰/۵۰
نصیب خاں حجام	"	"	۰/۳۱

تمدن و معاشرت

سرکاری ٹیکسوں کے راز	"	"	۰/۳۱
ضلع کی سرکار	"	"	۰/۳۱
کارخانوں کے قانون	"	"	۰/۳۱
بڑھئی	"	"	۰/۳۱

جھلکیاں

احمد علی	"	"	۰/۳۱
احمد ندیم قاسمی	"	"	۰/۳۱
اکبر الہ آبادی	"	"	۰/۳۱
حیات اللہ انصاری	"	"	۰/۳۱
سہیل عظیم آبادی	"	"	۰/۳۱
سید سلیمان ندوی	"	"	۰/۳۱
عبدالحق	"	"	۰/۳۱
میر امن	"	"	۰/۳۱
نذیر احمد	"	"	۰/۳۱

حفظان صحت

دق اور اس کا علاج	مرتبہ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ			۱/۳۱
زچہ بچہ	"	"	"	۱/۳۱
خسرہ اور چیچک	"	"	"	۱/۳۱
فوری علاج (ہڈی ٹوٹنا)	"	"	"	۱/۳۱
فوری علاج (حادثہ)	"	"	"	۱/۳۱

ڈراما

استری دھن	"	"	"	۱/۳۱
ٹھیک بات جیت کی ہے		"	"	۱/۳۱

سوانح حیات

اجمیری خواجہؒ	"	"	"	۱/۳۱
امیر خسروؒ	"	"	"	۱/۳۱
سوامی دیانند	"	"	"	۱/۳۱
غوث پاکؒ	"	"	"	۱/۳۱
کرشن کنہیا	"	"	"	۱/۳۱
گاندھی جی اول	"	"	"	۱/۳۱
" دوم	"	"	"	۱/۳۱
گرو نانک	"	"	"	۱/۳۱
مصطفیٰ کمال	"	"	"	۱/۳۱
نظام الدین اولیاؒ	"	"	"	۱/۳۱

کہانیاں

کہانیاں حصہ اول	"	"	"	۱/۳۷
" " دوم	"	"	"	۱/۳۷
پنچ تنتر " دوم	"	"	"	۱/۳۱
" " سوم	"	"	"	۱/۳۱

کھیتی باڑی

اپنی کھیتی کو پکا کرو	مرتبہ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ			۱/۳۱
آم کے باغ لگائیے	"	"	"	۱/۳۷
پپیتے کے باغ لگائیے	"	"	"	۱/۳۱
پھلوں کی کھیتی	"	"	"	۱/۳۱
پیڑوں کی کاٹ چھانٹ	"	"	"	۱/۳۱
جانور بھلا چنگا رہے	"	"	"	۱/۳۱
ساگ سبزی اگائیے	"	"	"	۱/۳۷
کواپریٹو فارمنگ	"	"	"	۱/۳۱
کھاد بنائیے	"	"	"	۱/۳۱
لیمو، انار، بیر	"	"	"	۱/۳۱
مقدمے کی مار	"	"	"	۱/۳۱
نتھو دھوان ہوگیا	"	"	"	۱/۳۱
ہرا چارہ ہرا رہے	"	"	"	۱/۳۱

مذہب

ابو داؤد شریف	"	"	"	۱/۳۱
کفن دفن	"	"	"	۱/۳۱
نسائی شریف	"	"	"	۱/۳۱

معلومات

چاند تارے	"	"	"	۱/۳۱
دن رات ودھنے	"	"	"	۱/۶۲
ہوائی جہاز حصہ دوم	"	"	"	۱/۳۱

متفرق

پنجابی لوک گیت	"	"	"	۱/۳۱
کہاوتیں	"	"	"	۱/۳۱

پرنٹر پبلشرز: سید احمد دہلی نے لبرٹی آرٹ پریس میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا